IBRAHIM NAJI : HIS LIFE AND POETRY

DISSERTATION SUBMITTED FOR THE DEGREE OF

Master of Philosophy

IN

Arabic

BY

KHURSHEED JABIN USMANI

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. S. KAFEEL AHMAD
(Reader)

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

1996

ابراہیم ناجی

حیات اور شاعری

مقالہ برائے ایم فل

عربی ادب

مقالہ نگار

خورشید جبیں عثمانی

نگراں

ڈاکٹر سید کفیل احمد قاسمی

شعبہ عربی

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

۱۹۹۶ء

DS2958

DS-2958.

MAULANA AZAD LIBRARY A.M.U.

فہرست مضامین

مقدمہ	۲ — ۷
باب اول: مصر کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات	۸ — ۱۹
باب دوم: ابراہیم ناجی: احوال زندگی	۲۰ — ۳۶
باب سوم: تحریک اپولو اور اس کے اثرات عربی شعر و شاعری پر	۳۷ — ۷۷
باب چہارم: ابراہیم ناجی بحیثیت شاعر	۷۸ — ۱۵۰
مصادر و مراجع	۱۵۱ — ۱۵۷

مقدمہ

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصری معاشرہ عربی ادب کے مختلف رجحانات سے روشناس ہوا۔ اس عہد میں جہاں ایک طرف بعض ادباء ہمیں قدیم اسلوب نگارش اور طرز تحریر سے چمٹے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف ہمیں بعض جدید اسالیب اور رجحانات بھی نظر آتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب عربی ادب کی مغربی ادبیات سے اثر پذیری ہے۔ یہ بات جہاں عربی نثر کے سلسلے میں درست ہے وہیں عربی شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہمیں مصر میں متعدد ادبی تحریکات کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں مثلاً تحریک دیوان، رابطۂ قلمیہ اور تحریک ابولو عربی ادب و شاعری کے ارتقاء میں خاص طور پر موخر الذکر تحریک کا غیر معمولی کردار ہے۔ اس تحریک نے زمانے کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے شعری سرمایہ کو وجود بخشا جس پر قدامت کی بھی چھاپ تھی اور جدید شاعری کے معیارات پر بھی پورا اترتا تھا۔ تحریک ابولو کے اثرات محض مصر ہی تک محدود نہ رہے بلکہ پورے عالم عرب کے شعراء اس سے متاثر ہوئے۔ اور اس کی بازگشت تمام عرب دنیا میں سنائی دینے لگی۔ اس تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی، علی محمود طہٰ، حسن کامل، صیرفی، عبد المعطی ہمشری، مصطفی عبد اللطیف سحرتی اور ابراہیم

ناجی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے مصری شعراء میں ابراہیم ناجی بہت شہرت کے حامل ہیں۔ ان کی پوری شاعری رومانیت سے متاثر نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار درد انگیز اور کرب آمیز ہوتے ہیں جو دلوں کو موہ لینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے حسین اور دلنشین انداز میں ایسا سماں باندھتے ہیں کہ قاری اور سامع مسحور رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے دل کے درد و کرب کو چھپایا ہے۔ روح کی پیاس، محبت کی تپش اور سوزش کی تعبیر جتنے خوبصورت انداز میں انھوں نے کی ہے اس سے بہتر انداز اختیار نہ کیا جا سکا۔ ان کی ساری زندگی ایک ایسی پیاسی روح کی طرح گذر گئی جو محبت کی پذیرائی کی تلاش میں ہمیشہ بھٹکتی رہی۔ اور وہ اپنی ان ناکامیوں کو قوت گویائی عطا کرتے رہے۔ نتیجے میں عربی زبان کے دامن میں وراء الغمام، لیالی القاھرہ اور الطائر الجریح جیسے مجموعات نے مزید ستارے ٹانک دیئے۔ یہ دواوین ان کی پیاسی روح کی بہترین غمازی اور تحریک اپولو کے شاعرانہ میلانات کی سچی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے نہ صرف اس وقت ساری فضا متاثر ہوئی۔ بلکہ بعد کے آنے والے شعراء بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ابراہیم ناجی کی شاعری رقت و جزالت تر و تازگی اور عظمت میں اپنی مثال آپ ہے۔ وہ کسی لفظ کا بے محل استعمال نہیں کرتے اور کوئی مفہوم نکالنے میں تکلف

سے کام نہیں لیتے۔ ان کے کلام میں پیچیدگی، غموض، التباس اور کرختگی نہیں۔ بلکہ ان میں ایسی سلاست، جدت اور ندرت پائی جاتی ہے، جو طالبان ادب کے لئے بہترین سرمایہ ہے۔

ابراہیم ناجی کی اس اہمیت کے باوجود یہ بات باعث تعجب ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری ادباء اور محققین کی جانب سے جتنی توجہ کی مستحق تھی وہ انھیں حاصل نہ ہوسکی۔ جدید عربی ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے ضمنی طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔ محض ایک مختصر سی کتاب انکی حیات اور شاعری پر ملتی ہے۔ اور چند مقالے ان پر تحریر کئے گئے ہیں۔ اس صورت حال میں میری خواہش ہوئی کہ ابراہیم ناجی کی شاعری کو اپنے مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بناؤں اور جدید عربی ادب میں ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا مقام اور مرتبہ متعین کروں۔ پیش نظر تحقیقی مقالہ اسی خواہش کی تکمیل ہے۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اس کے تناظر میں ابراہیم ناجی کی شخصیت اور ادب کا اندازہ کیا جا سکے۔

دوسرے باب میں ابراہیم ناجی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں پیدائش و پرورش،

تعلیم اور ادبی کارناموں کا واضح انداز سے ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں تحریک اپولو اور عربی شعر و شاعری پر اس کے اثرات سے متعلق ہے۔ جس میں اس تحریک کی خصوصیات اور اس کے امتیازات پر توجہ دی گئی ہے۔ اس تحریک سے منسلک شعراء کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ شاعر ابراہیم ناجی اس وقت اس تحریک کے ایک سرگرم ممبر تھے جب یہ فکری تحریک اپنے شباب پر تھی، اس تحریک سے منسلک ہونے کے بعد ابراہیم ناجی ایک مجدد شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے اور انھوں نے اسی لب و لہجہ کو اختیار کیا جو اس تحریک کا خاصہ رہا ہے۔

چوتھا باب ابراہیم ناجی کی شاعری سے متعلق ہے۔ جس میں ان کی شاعری کی خصوصیات اور ان کے فنی کارنامے پر بحث کی گئی ہے۔

میری کوشش رہی ہے کہ اس موضوع سے متعلق تمام مواد تک رسائی حاصل کر سکوں۔ تمام مواد تو کجا میں اپنی تمام تر سعی و جہد کے باوجود اس کے دیوان کے حصول میں ناکام رہی۔ چونکہ ہندوستان میں عربی کتب اور بالخصوص بیرونی ممالک کے عربی ادب سے متعلق مواد کی فراہمی کمیاب ہے جسکی تشنگی کو ہم سب محسوس کرتے ہیں اور یہ کمی یقیناً ہمارے تحقیق و تفکر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس موضوع سے متعلق اگر مواد تک رسائی ہو جاتی تو شاید موضوع کے حق ادا کرنے میں ایک حد تک میں کامیاب ہوتی۔

اس وقت جبکہ یہ مقالہ اپنی پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے میں بارگاہ ایزدی میں اپنے رب کائنات کا شکر بجا لاتی ہوں جس نے مجھے نہ صرف حصول علم کی توفیق دی بلکہ مجھے اس قابل بھی بنایا کہ اپنی کاوش بھی پیش کر سکوں۔

اس موقع پر اگر میں ان لوگوں کا ذکر نہ کروں جن کے تعاون سے اس مقالہ کی تکمیل میں کامیابی ہوئی تو یقیناً احسان فراموشی ہوگی۔ لہذا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جناب سید کفیل احمد قاسمی صاحب کا جنکی سرپرستی و رہنمائی میں یہ مقالہ لکھنے کی اہل ہو سکی۔ ان کے علاوہ شعبہ کے دیگر اساتذہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھے اس لائق بنایا کہ میں یہ مقالہ پورا کر سکوں۔

برادر رضی الاسلام ندوی صاحب جنکی میں بے حد عزت کرتی ہوں شکر گذار ہوں جن سے میں نے فیض حاصل کیا۔ برادر جمشید احمد ندوی کی مشکور ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں اور مشکل عبارت کے حل کرنے میں میری مدد کی۔ مقالہ کی تکمیل میں اپنی عزیز ترین دوستوں سطوت ریحانہ اور کوثر فاطمہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے پورے خلوص کے ساتھ پروف ریڈنگ اور مقالہ کی تیاری کے تمام مراحل میں بھرپور تعاون دیا۔

اس وقت اپنے بھائیوں اور بہنوں کے شکریہ کے

اظہار کے احساس سے میرا دل خالی نہیں ہے۔ جن کا تعاون کسی نہ کسی طرح سے ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔

اخیر میں میں اپنے والدین کی بے لوث محبتوں اور بے پایاں شفقتوں کی بھی ممنون ہوں جن کی نیک تمنائیں اور پر خلوص دعائیں میرا سرمایہ حیات ہیں۔ ان کی قربانیوں کو دیکھتے ہوئے میری آنکھیں فرط مسرت سے چھلک پڑتی ہیں کہ انھوں نے ایک مدت تک اپنے آپ سے الگ کر کے علم کی اس اونچائی تک پہنچایا اور اس طرح انھوں نے اپنی اس قربانی سے میرے اندر علم کی اہمیت کو ثابت کیا۔

رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا ہ

خورشید حبیب عثمانی
ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مصر کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات

(انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں)

سیاسی حالات:۔

مصر میں عہد جدید کا آغاز ۱۷۹۸ء میں نپولین کے حملے سے ہوتا ہے جس نے اپنی مختصر سی مدت قیام میں مصری عوام میں خود اعتمادی پیدا کرنے، انہیں اپنا ہمنوا بنانے اور وہاں کی سماجی و سیاسی اصلاح کے لئے زبردست اقدام کئے جسکا ایک پہلو حکمراں مجلس کی تاسیس بھی ہے جس کے گہرے اثرات اہل مصر کے شعور و افکار پر پڑے کیونکہ مصریوں کو پہلی مرتبہ یہ موقعہ ہاتھ آیا کہ وہ امور سلطنت میں رائے و مشورہ دے سکیں۔[1]

نپولین کی واپسی کے بعد اہل مصر نے انگریز و ترک افواج کی مدد سے فرانسیسیوں کو مصر سے نکال دیا اور اسی فوج کے ایک البانی افسر محمد علی کو اس کے حسن سلوک سے گرویدہ ہو کر مصر کا والی بنا دیا۔

فرانسیسی فوج کی واپسی کے بعد ۱۸۰۵ء میں البانوی نژاد محمد علی (۱۷۶۹ — ۱۸۴۹) مصر کا حکمراں مقرر ہوا۔ اور اس نے بہت جلد مرکز سے کٹ کر اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ محمد علی مغرب کی ترقی و تہذیب سے بہت متاثر تھا اور وہ مصر میں مغرب کے نقش قدم پر ایک مضبوط سماج کی بنیاد ڈالنا چاہتا تھا۔[2] محمد علی کو اپنا والی منتخب کر کے مصری عوام کو یہ امید تھی کہ اس کے ذریعہ مصر میں امن و انتظام کا ماحول پیدا ہوگا۔ ظلم و ستم، اضطراب و بے

---

(۱) الادب العربی المعاصر، شوقی ضیف، ص ۱۲

(۲) نفس مصدر ص ۱۴

چینی کا دور ختم ہوگا۔ اسی انسانی جذبہ کے تحت انھوں نے محمد علی کا خیر مقدم کیا۔[1]

محمد علی نے مصر کو ترقی دینے کے لئے سیاسی استحکام اور معاشی نظام کو بہتر بنانے کی بے انتہا کوششیں کیں۔ اس کے دور میں کپاس کی پیداوار میں قابل رشک ترقی ہوئی۔ اس نے مصر کو اقتصادی طور پر بہتر بنانے کے لئے صنعتی دور میں بھی شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر مغربی ملکوں نے اس خیال سے کہ اگر مصر صنعتی دور میں داخل ہوگیا تو مغربی ملکوں کی مصنوعات کو سخت نقصان پہنچے گا محمد علی کے صنعتی منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ محمد علی کی توجہ کا مرکز کسانوں کی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ وہ حکومت کی مرکزیت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مصر کی تمام پیداوار کا حساب لگا کر اسکی آمدنی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا۔ پہلے کے مقابلے میں کچھ ٹیکسوں میں کمی کی اور کچھ میں اضافہ کر دیا، ٹیکس اور کرایہ کاٹ کر غلہ فروخت کیا جاتا پھر اسکی آمدنی میں کسانوں کو ان کا حصّہ دیدیا جاتا تھا۔[2]

محمد علی نے سرکاری کام کی بجا آوری کے لئے انتظامی محکمے (دیوان) قائم کئے جنھوں نے مصر کی ترقی میں نمایاں کردار انجام دیا۔[3]

محمد علی کے زمانے میں تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بہت سے جدید مدارس قائم کئے گئے جنمیں دار الھندسۃ اور دار العربیۃ بہت اہم ہیں۔[4] ذہین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجا گیا۔ رفاعہ الطھطاوی کی نگرانی میں ایک دار الترجمہ

---

(۱) فکر و نظر بحوالہ سیرۃ السیدہ عمر مکرم، محمد فرید ابو حدید ص ۱۸۹

(۲) عصر محمد علی، الرافعی، ج ۳ ص ۵۸۲-۹۲ (۳) فی الادب الحدیث، عمر الدسوقی، ص ۱۸-۱۹

(۴) تاریخ العالم العربی فی العصر الحدیث، الدکتور احمد عزت عبد الکریم ص ۷۷

قائم کیا گیا جسکا مقصد یورپی زبانوں کی اعلیٰ تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کرنا تھا۔ اصلاً ترجمہ ہی کے ذریعہ عربی زبان وادب میں وسعت پیدا ہوئی اسے بہت سارے نئے موضوعات ومسائل سے سابقہ پیش آیا۔ عربی ادبیات میں نئے اصناف سخن کا اضافہ ہوا۔ مصری ادباء وشعراء نظم ونثر کی بہت ساری ایسی قسموں سے واقف ہوئے جن سے وہ ہنوز غافل اور لاعلم تھے۔ ترجمہ کی تحریک کو فروغ دینے میں رفاعہ الطہطاوی کی کوششوں اور "مدرسۃ الالسن" کی خدمات کا بہت بڑا دخل ہے۔ مغربی ادبیات کو عربی میں منتقل کرنے کا اثر یہ ہوا کہ عربی شعر وشاعری میں مغربی اصولوں کو اختیار کرنے کا رجحان بڑی تیزی کے ساتھ بڑھا۔

محمد علی کے بعد اس کے جانشین عباس (۱۸۴۸ - ۱۸۵۴) اور سعید (۱۸۵۴ - ۱۸۶۳) بھی اسی کی پالیسی پر قائم رہے۔ سعید کی حکومت کا قابل ذکر کارنامہ نہر سوئز کی تعمیر ہے۔ اس نہر نے مصر کو بین الاقوامی تجارت کا ارزاں ترین اور قریب ترین راستہ بنا دیا اور یوں مصر کی اہمیت میں بے اندازہ اضافہ ہوگیا۔ اور مصر پوری دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

نہر سوئز کی وجہ سے مصر نے جو اہمیت حاصل کرلی تھی اس نے مصر کے لئے کئی خطرات پیدا کردیئے اب مصر پر قبضہ کرنے کی برطانوی کوششوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اور برطانیہ کو مصر پر تسلط کے لئے نیا دروازہ کھل گیا۔[1]

سعید پاشا کے انتقال کے بعد اسماعیل پاشا (۱۸۶۳ - ۱۸۷۹) اس

---

(۱) عصر اسماعیل، عبدالرحمٰن الرافعی، ج ۱ ص ۵۱ - ۷۷

کا جانشین ہوا۔ یہ محمد علی کے جانشینوں میں پہلا شخص تھا جسے سلطان عبدالحمید کی طرف سے خدیو کا لقب ملا۔[۱]

اسماعیل نے مصر کے لئے بہت سے اصلاحی کام کئے۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں کارخانے قائم کئے۔ شکر، ریشم، شیشہ کی تجارت، ڈاک کا نظم قائم کیا، بندرگاہیں تعمیر کروائیں اور کاشتکاری کو فروغ دینے کے لئے نہریں بنوائیں۔[۲] نیز نہر سوئز کی تعمیر کے معاہدے میں اسماعیل نے بہت سی ترامیم منظور کرا لی تھیں جن پر کثیر رقوم خرچ ہوئیں۔ نتیجے میں ملک قرضوں کے بوجھ تلے دبتا گیا۔ برطانیہ اور فرانس نے اسماعیل سے ایسی وزارت قائم کروائی جسمیں دونوں ملک کے نمائندے موجود تھے۔ ان سب باتوں سے اس کے خلاف مصریوں میں نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ ۱۸۷۹ء میں خدیو اسماعیل کو معزول کئے جانے کے بعد اس کے بیٹے توفیق کو خدیو مصر مقرر کیا گیا۔

توفیق کے عہد میں یورپی اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا رہا جس کی وجہ سے ملک میں عدم اطمینانی اور غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے ان حالات میں قوم کی قیادت سابق وزیر اعظم شریف پاشا اور ایک فوجی افسر اعرابی پاشا نے سنبھال لی۔ ۱۸۸۱ء میں توفیق

---

(۱) عصر اسماعیل ج ۱، ص ۷۴

(۲) نفس مصدر ص ۲۳-۲۴

پاشا نے شریف پاشا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا بعد ازاں شریف پاشا کے مستعفی ہونے پر بارودی پاشا وزیر اعظم اور اعرابی وزیر جنگ مقرر ہوئے۔[1] ۱۸۸۲ء میں مصر میں عوام پر ہونے والی ظلم و زیادتی اور ملک کے اندر سامراجی قوتوں کی من مانی کے خلاف احمد پاشا اعرابی کی قیادت میں فوج نے بغاوت کر دی، اعرابی کا نعرہ مصر اور مصری عوام تھے اس لئے ہر فرقہ کے لوگ اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے اور یہیں سے مصری قوم پرستی کی بنیاد پڑی۔ جب بغاوت کا معاملہ معرکہ آرائی تک جا پہنچا تو خدیو نے انگریزوں سے مدد طلب کی۔ انگریز جو مدت سے منتظر تھے دعوت ملتے ہی ان کے جنگی بیڑے اسکندریہ کے لئے روانہ ہو گئے ۱۸۸۲ء میں خونریز لڑائی کے بعد ان کا مصر پر قبضہ ہو گیا۔

برطانوی حکومت کے اصرار پر اعرابی پاشا اور ان کے رفقاء پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور ان میں سے بیشتر کو عمر قید کی سزا دی گئی جبکہ اعرابی پاشا کو جلا وطن کر دیا گیا ملک کے سیاہ و سفید کا مالک لارڈ کرومر تھا اور توفیق پاشا برائے نام حکمران تھا۔ مصری وزراء کے ساتھ برطانوی مشیر بھی کام کرتے تھے جن کے اختیارات وزراء سے زیادہ تھے۔

۱۸۹۲ء میں خدیو عباس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی لارڈ کرومر سے ان بن رہتی تھی اس زمانے میں اعرابی تحریک تو ناکام ہو گئی تھی لیکن اندر ہی اندر بعض قومی رہنماؤں نے انگریزی سامراج کے خلاف منتشر قوت کو یکجا کرنے کی کوشش کی جنمیں مصطفیٰ کامل کی شخصیت قابل ذکر ہے ان کے

---

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب لاہور ج ۲۱ ص ۲۰۲

اخبار اللواء نے مصریوں کے اندر حب الوطنی کی روح پھونک دی۔ اخبار اللواء کے ذریعہ تعلیم یافتہ مصریوں پر انھوں نے اپنا بے حد اثر قائم کر لیا تھا۔ انھوں نے کئی آزاد مدرسے کھولے جن کے طلبہ نے آگے چلکر قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نیز انھوں نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۷ء میں الحزب الوطنی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔[1] اس جماعت کا مقصد انگریزی سامراجیت کو ختم کرنا اور اسلامی خطوط پر مصر کو ترقی و خوشحالی دلانا تھا۔ ادباء و شعراء کی ایک کثیر تعداد اس جماعت سے منسلک تھی۔ یہ تحریک مصطفی کامل اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ ترقی پا رہی تھی لیکن اس کی پشت پناہی خدیو عباس کر رہا تھا اور اس وقت تک اس کا ساتھ دیتا رہا جبتک اسے اس میں اپنا مفاد نظر آیا۔ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۹۰۸ء میں مصطفی کامل کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے دوست محمد فرید نے اس جماعت کی ذمہ داری سنبھالی۔

مصر پر برطانیہ کا قبضہ پہلی جنگ عظیم تک برقرار رہا اور اس دوران انگریزی حکمت عملی کے تحت مصر کی حالت مجبور و مقہور ملک کی سی رہی۔ لیکن مصر کے آزادی پسند عوام میں قوم پرستی کا جذبہ ابھرا اور آزادی کی تحریک نے جنم لیا۔ ۱۹۲۲ء میں تحریک آزادی زور پکڑ گئی جس کو روکنے اور اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے برطانیہ نے مصر کو برائے نام خود مختاری دیدی۔ برطانیہ کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے مصر کی سیاسی

---

(۱) تاریخ مصر السیاسی، امین سعید ص ۱۵۸

جماعت "وفد پارٹی" نے بڑی خدمات انجام دیں۔ اس پارٹی کی قیادت مصر کے دو عظیم فرزندوں سعد زغلول اور نحاس پاشا نے کی۔ برطانیہ کے زیر نگیں مصری فوج میں بھی قوم پرست کافی تعداد میں موجود تھے جو مصر کی آزادی کے لئے کوشاں تھے اور ان کی ساری ہمدردیاں آزادی کی جنگ لڑنے والی وفد پارٹی کے ساتھ تھیں۔ وفد پارٹی نے آزادی کے لئے جو جدوجہد شروع کی تھی وہ بڑی نتیجہ خیز رہی اور بالآخر ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدے کے تحت برطانیہ صرف چند مخصوص علاقوں میں خاص طور پر نہر سوئز کے علاقوں میں اپنی فوج رکھنے کا مجاز پایا۔

سماجی حالات:-

عثمانی حکومت کے بعد جب انگریز مصر میں برسر اقتدار آئے تو سماجی سطح پر اہم تغیرات رونما ہوئے۔ سب سے بڑا جو تغیر ہوا وہ یہ کہ اہل مغرب سے ان کی براہ راست شناسائی ہوئی۔ ان کی تہذیب، کلچر اور سماجی رسم و رواج کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نتیجتاً لوگوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور ریت و رواج کو بڑی تیزی سے اپنایا اور دھیرے دھیرے پورا سماج اس رنگ میں رنگنے لگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مصر کا ایک بڑا طبقہ یورپی ممالک میں تعلیم و تربیت کی غرض سے گیا اور واپسی پر اس نے مکمل طور پر مغربی تہذیب و تمدن کی وکالت کی۔ اور اپنے علوم و فنون کا مذاق اڑایا۔[1]

---

(۱) الاتجاهات الوطنية، الدكتور محمد حسين، ج ۲، ص ۲۷۵

جن میں علی عبدالرزاق، قاسم امین اور طٰہٰ حسین کے نام سرفہرست ہیں۔
اس وقت سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء — ۱۸۹۷ء) اور محمد عبدہ (۱۸۴۹ء — ۱۹۰۵) کی شخصیت سامنے آتی ہے جن کی تحریک نے سماجی سطح پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔

جمال الدین ایک مصلح تھے جن کے پیغام کو مفتی محمد عبدہ نے عام کیا۔ چنانچہ محمد عبدہ کے غیر معمولی اثرات جدید عرب شعراء پر پڑے جس کا اندازہ شوقی، بارودی اور ان کے ہم عصر شعراء سے لگایا جاسکتا ہے۔

ان دونوں کی اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی اثرات کو ختم کیا جائے اور جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ دوسری چیز یہ کہ سماج جس طرح مغربی تہذیب وتمدن سے غیر معمولی طور پر مرعوب ہوا ہے۔ اسے مرعوبیت کے دام فریب سے نکالا جائے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس تحریک سے متاثر ہوئی اور اس کی علمبردار ہوگئی۔ تیسری تبدیلی جو سماج میں ہوئی یہ وہ امراض تھے جو سماج کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ مثلاً "آزادی نسواں کی ضرورت" "غربت" "جہالت" اور "عصمت فروشی" بہت سے شعراء نے ان مسائل پر اپنے کلام میں اظہار خیال کیا ہے۔ الزہی اور الرصافی جیسے شعراء نے اس کے لئے قصہ بیانی کا انداز اختیار کیا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں شعر میں کہی جاتی تھیں۔ جن میں ایک اخلاقی قدر ظاہر ہوتی تھی۔ خصوصاً

احمد شوقی اور حافظ ابراہیم نے اس میدان میں غیر فانی نظمیں کہی ہیں۔

ادبی حالات :-

تاریخ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہی دور جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا گواہ ہے عربی ادب کے زوال کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جسے مورخین عثمانی دور کہتے ہیں۔ اس دور میں عربی شاعری بے روح ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں نہ تو کسی قسم کا پیغام ہی مضمر تھا اور نہ ہی اسے پڑھ کر کسی قسم کا جوش وخروش، جذبہ و ولولہ دل میں پیدا ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امراء کی مرضی کے مطابق شعراء ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اور اس مدح سرائی میں قلبی احساسات کے اظہار کا فقدان ہوتا تھا۔ اور ہر شاعر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں اپنا پورا پورا زور صرف کیا کرتا تھا۔ نتیجے میں اس زمانے میں جو ادب پروان چڑھا وہ بالکل ہی ناقص اور بے روح تھا۔ خصوصاً شاعری کہ وہ صرف تک بندی اور قافیہ بندی تک محدود ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ عربی زبان نے اب دم توڑا تب دم توڑا۔ لیکن خدا کو اس کی بقا منظور تھی۔ لہذا انیسویں صدی کے اواخر میں بارودی جیسا قدآور شاعر میدان میں آیا جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عربی شاعری کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہمارے سامنے شاعری کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو قدیم عربی شاعری کے مشابہ تھی(۱) جس میں سوز بھی تھا اور ساز بھی۔

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے۔ دراسات ادبیہ، الدکتور احمد ھیکل، ص ۶۱-۶۲

جس میں تڑپ بھی تھی اور لگن بھی۔ جس میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی تھا حتی کہ حسن زیات کو یہاں تک کہنا پڑا " جاہلی شاعری کا میر کارواں اگر امرؤالقیس تھا تو جدید عربی شاعری میں اس کا اہم پلہ بارودی ہے۔ جنکی شاعری جدید عربی شاعری کی آبرو ہے"(۱)

قانون فطرت ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ بارودی نے جس بیج کو بویا تھا اور اس کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی تھی اسے بعد کے آنے والے شعراء نے ایک تناور درخت بنا دیا۔ بلکہ اس کی اتنی شاخیں نمودار ہوئیں جنکا تصور قدیم عربی ادب میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بارودی اور ان کے متبعین کی کوشش جلد بار آور ہوئیں اور مختلف قسم کے مدارس فکر کی بنیاد پڑی۔ ان میں سے کچھ لوگ قدیم ادب کو اصل سرمایہ سمجھتے تھے اور اس لئے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ بعض اس کی مخالفت کے قائل تھے اور قدیم کو بالکل عبث سمجھتے تھے۔ جبکہ بعض نے ان دونوں کے درمیان راہ اپنائی جس نے آگے چل کر عربی ادب کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اسی مدرسے کے دور رس اثرات عربی زبان و ادب پر مرتب ہوئے اور نت نئے تجربات کی بنیاد پڑی۔ اسی مدرسہ فکر سے ہمارے شاعر ابراہیم ناجی کا تعلق تھا جسے دنیا " جماعت اپولو" کے نام سے جانتی ہے۔ اس مدرسہ کے متبعین نے " خذ ما صفا ودع ما کدر"

---

(۱) تاریخ الادب العربی، حسن زیات، ص ۳۷۷

کے زریں اصول پر عمل کرتے ہوئے پہلے مدرسہ سے صاف ستھری اور شفاف فنی روح، بہترین اسلوب، اور موثر شاعرانہ موسیقیت کو اپنایا تو دوسرے مدرسہ سے نت نئے تجربات پر اعتماد، شاعری کے افق میں توسیع، قصیدہ کی وحدت پر زور اور اسے فنکارانہ شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت کو اپنایا۔ خصوصاً مغربی ادب سے استفادہ کیا اور مغرب کے ادب سے بھی رومانی پہلو سے زیادہ متاثر ہوکر دونوں مدرسوں کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زندہ وجاوید شاعری کی۔ جسکی آب وتاب آج تک باقی ہے اور جس کی وجہ سے عربی زبان وادب کا کھویا ہوا مقام دوبارہ مل گیا اور عالمی ادب کے روبرو کھڑی ہوکر دیگر زبانوں کے ادباء وشعراء کو دعوت سخن دینے لگی کہ کوئی ہے جو میرے ان سپوتوں کا مقابلہ کرسکے۔

---

(۱) دراسات ادبیۃ ص ۱۶۴

ابراهیم ناجی: احوال زندگی

پیدائش

ابراہیم ناجی ۳۱ر دسمبر ۱۸۹۸ء میں قاہرہ کے محلہ شبرا میں پیدا ہوئے۔ دیگر بعض سوانح نگار ان کی پیدائش ۱۸۹۹ء لکھتے ہیں ایسے ہی ایک موقع پر ان کے ایک خاص دوست استاد صالح جودت نے ایک ادبی چٹکلہ سنایا ہے کہ "وہ وداعی صدی سے بے نیازی پر بھی آمادہ نہ تھے اور اپنی زندگی کے باقی دن نئی صدی یعنی بیسویں صدی میں گذارنا چاہتے تھے تاکہ قدیم و جدید صدی کا سنگم بنا سکیں"۔ ناجی ایک ایسے مہذب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جسکی گذر بسر درمیانی درجہ کی تھی نہ تو خوشحالی نکتۂ عروج پر تھی اور نہ ہی غربت و افلاس کے سائے تھے۔

لقب :-

شاعر ابراہیم ناجی میں ناجی کا لفظ انہیں اپنے والد احمد ناجی سے ملا ہے۔ استاد صالح جودت کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ ناجی کے والد اور چچا جب پرائمری اسکول میں پہنچے تو کلاس ٹیچر نے ان سے ان کا لقب دریافت کیا۔ انھوں نے اپنا لقب "القصبجی" بتایا۔ کلاس ٹیچر نے کہا کہ نہیں بلکہ آپ دونوں کا لقب ناجی ہے۔ یہ دونوں بچوں کی تقدیر ہی کی بات تھی کہ وہ اپنے اس نئے لقب سے کامیاب ہوئے۔ آگے صالح جودت یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کا لقب بدل جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے اس لئے کہ اس زمانے میں عصری اسکولوں میں طلباء کے القاب بدل

کر ترکی القاب رکھے جاتے تھے۔ مثلاً شوقی، وجدی اور شکری وغیرہ۔ اس خاص نظام کے باعث ان دونوں نے نیا لقب پایا۔ پھر وہ دونوں بچے اپنے والد ابراہیم القصبجی کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آج سے ہمارا نام محمد ناجی اور احمد ناجی ہے۔ ان کے والد مسکرائے اور کہا کہ میں بہرحال اپنے لقب پر قائم ہوں۔ کیونکہ میری پیدائش ہی اسی لقب کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ ابراہیم القصبجی اپنے بزرگوں کی طرح سونے کے دھاگے لپیٹنے کا کام کرتے تھے۔ جو "قصب" کے نام سے معروف ہے۔[1]

والدین:-

جب ناجی نے اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی تو خود ان کے معزز گھرانے سے ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ ان کے والدین نے انہیں بہترین زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ اس لئے کہ گھر ہی بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی اولین درسگاہ ہے۔ ان کے والد اعلیٰ تہذیب کے علمبردار تھے باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں کوئی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اور نہ کسی استاد کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا۔ لیکن ملازمت کے دوران محض اپنے ذاتی شوق، مطالعے اور کتب بینی کے شغف کے نتیجے میں وہ مختلف میدانوں میں مہارت حاصل کر گئے۔ اور محکمۂ ڈاک کے ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور

---

(۱) ناجی حیاتہ و شعرہ، صالح جودت ص ۱۶

ایک دن وہ بھی آیا جب وہ اپنے محکمہ کے اعلیٰ ترین انگریز اور مصری افسران کے بھرپور اعتماد کے سہارے محکمۂ ڈاک کے شعبۂ اصلاح کے سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ محمد ناجی جوانی کے زمانے سے ہی ایک ایسے شخص تھے جس میں ذاتی شرافت کے ساتھ ہی ساتھ خودپسندی، قوت یادداشت، انتہائی درجہ کی ذہانت اور علم و معرفت کی طرف پیش قدمی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے انگریزی زبان محض ماہرین سے سن کر ہی بہت جلدی سیکھ لی اور اسے روانی کے ساتھ بولنے لگے۔ بچپن اور جوانی کے اسی درمیانی عرصہ میں علم کی طرف ان کے رجحان کا آغاز ہوا۔ دینی معلومات میں جلا پیدا ہوئی اور علم روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ کیونکہ جو کتاب بھی ان کے ہاتھ پڑتی تھی اسے پڑھے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔ انگریزی زبان کے بعد عربی کی طرف توجہ کی اور اس میں ملکہ حاصل کیا۔ پھر فرانسیسی زبان کی طرف متوجہ ہوئے اور اس پر عبور حاصل کیا۔ بعد ازاں اطالوی زبان کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی ید طولیٰ حاصل کیا۔ ہر میدان میں خواہ ادبیات کا ہو یا علوم و فنون کا یا پھر صناعات غرض ہر میدان میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ان کی لائبریری میں عربی و فرانسیسی کا بڑا وقیع اور قیمتی سرمایہ موجود تھا۔ یہ علمی ورثہ ناجی کو ملا۔ علوم و فنون کی طرح سے ان کا دینی میلان بھی خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ شیخ محمد عبدہ مرحوم کے جاری کردہ رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کا مطالعہ بڑے شوق کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ وہ مشہور و معروف رسالہ ہے جو اپنے قاری

کے ذھن وقلب پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ محمد ناجی بھی اس مذکورہ رسالہ کے ہر شمارہ کو شروع سے اخیر تک بڑی پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ہر شمارہ کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان میں سے شائع شدہ ہر فقہی اور دینی مسئلہ کو ذھن میں محفوظ کر لیتے تھے۔ اس قوی مطالعہ سے ان کے دینی جذبہ کو تقویت ملی۔ ان کی ماں بہیتہ نامی ایک خاتون تھیں جو مصطفی سعودی کی صاحبزادی تھیں۔ مصطفی سعودی کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسین رضؓ سے جا ملتا ہے۔ ناجی کی والدہ انتہائی شریف، دیندار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ اور اپنے بیٹے کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔(۱)

تعلیم :-

ابراہیم ناجی کی عمر پانچ سال کی بھی نہیں ہو پائی تھی کہ ان کے والد نے ان کا داخلہ اسکول میں کرا دیا۔ یہ اسکول مصر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا اور گھر سے سب اسکولوں سے زیادہ قریب پڑتا تھا۔ وہاں ناجی نے تین سال اساتذہ سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے میں گزارے اور اپنی عقل کامل اور بے پناہ ذہانت کے باعث اسکول کے اساتذہ کی نظر میں بڑا مقام پایا۔ وہ لوگ ناجی کی حد درجہ ذہانت پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے اس اسکول میں تین سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پھر باب الشعریۃ الابتدائیۃ اسکول میں داخل ہوئے۔ اور وہاں اپنے تمام ساتھیوں سے

---

(۱) ناجی حیاتہ وشعرہ ص ۱۶-۱۸

سبقت لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اور موقع بہ موقع انعامات بھی حاصل کرتے رہے۔ اس مختصر مدت کے دوران انھوں نے قراءت اور کتابت پر بھی عبور حاصل کیا۔ اور ۱۹۱۱ء میں امتیازی نمبروں سے پرائمری سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم کے بعد ناجی نے سکنڈری اسکول میں داخلہ لیا۔ اس طرح ان کا تعلق شبرا کے مدرسہ "توفیقیۃ" سے ہو گیا۔ اگرچہ وہاں کے مقررہ نصابات میں بہت گنجائش تھی۔ لیکن ان کا ذاتی میلان ادب کی طرف تھا۔ لہذا اپنے والد کی لائبریری سے ہر وہ کتاب پڑھی جو ان کے ہاتھ لگی کیونکہ ان کے والد کی لائبریری مختلف موضوعات پر مبنی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھی۔ جس میں ادبیات پر بھی کتابیں تھیں اور سائنسی موضوعات پر بھی۔ مگر ان کا رجحان ادب کی کتابوں کی طرف بہت زیادہ رہا۔

ابراہیم ناجی نے جب ثانوی تعلیم مکمل کرلی تب انھوں نے ایسے ماحول کی طرف دیکھنا شروع کیا جو پہلے سے وسیع تر تھا۔ اور وہ تھا یونیورسٹی کا ماحول۔ ان کے ساتھ بھی وہی مسائل درپیش ہوئے جو دیگر طلبہ کو ہوتے ہیں کہ وہ کلیۃ الآداب میں داخلہ لیں یا سائنس کو ترجیح دیں۔ اس مسئلے کو لیکر وہ ذہنی کشمکش کا شکار تھے جس کو وہ خود ذیل کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

" کانت نزعتی للادب طاغیۃ۔ وکنت اعد نفسی لمستقبل ادبی۔

ولم تكن عندي اية فكرة عن الناحية العلمية الرياضية، غير ان الاقدار تلعب دورها بدون ان نعلم"۔

" ففي السنة التي قررت فيها ان التحق بالقسم الادبي، ارسل الله لنا معلما سوريا لم يكد ينظر إلي، حتى توسم فيّ شيئاً لا اعلمه، جعله يومن بانني تداكون نابغة في الرياضة - فوجه اهتمامه الي - وكان قاسياً جدا، اذ كان يضربني ويشتمني، وكثيرا ما دخل الفصل وهو ثمل، ثم اخذ يبسط هذا الطل بالضرب والشتم واللعن: وانا صابر لا اتفوه بكلمة"۔

" وكان رحمه الله طيب القلب، يخفي خلف هذه القسوة نفساً من الذهب، فكان يلاطفني بعد قسوته؛ ويمد يده الى بواجبات خاصة منه، ثم يعود في اليوم التالي وليسأل لي في خشونة: هل عملت الواجبات؟

" ولم اخيب ظنه مرة واحدة - وقد كان لقدمي سر ليا جعله يزهو ويفخر لي، ثم اخذت قسوته تختفي وهو يقول: اطلع يا ناجي، اشرح لهم التمرين"۔

" لقد كان تاثير هذا المعلم في مستقبلي كبيرا، فقد غيرت التحاقي بالقسم الادبي والتحقت بالقسم العلمي، ولتقدمي وتفوقي دخلت كلية الطب"(١)

مدرسہ طب سے منسوب ہوتے ہی ناجی نے ایک دوسری دنیا میں

---

(١) ناجی حیاتہ و شعرہ ص ٤٢-٤٣

قدم رکھا۔ اس میں سخت محنت کی ضرورت تھی۔ اگرچہ ان کو پہلے سال دقت ہوئی مگر پھر بھی وہ دوسرے سال ہی سے اس نئے ماحول سے مانوس ہونے لگے اور ان کو طب سے دلچسپی ہونے لگی۔ اس دلچسپی کا اظہار ابراہیم ناجی خود ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" اخذت ادرس الطب علی طریقة فنیة فقد کنت ابتدع لرفاقی الصور واخترع لهم من فنون الکتابة مایعینهم علی الحفظ وظللت کذالک الی الساعة التی اکتب فیها هذا از اول الطب کانه فن، واکتب الادب کانه علم، ای ارا عی فیه المنطق والتجدید والوضوح "(۱)

اس طرح وہ ہر سال اپنے تمام ساتھیوں سے ممتاز اور فائق رہے۔ صرف چوبیس ۲۴ سال کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں منصورہ کے مدرسۂ طب M.B.B.S کی سند حاصل کی اور ایک کامیاب طبیب بن گئے۔ مختلف وزارت میں انھوں نے طبی خدمات انجام دیں۔ وزارت اوقاف میں ان کو صحت عامہ کے شعبہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔

دوران تعلیم طب ناجی کی شاعری ان کے دوستوں اور اساتذہ میں اس حد تک مشہور ہو چکی تھی کہ وہ ایک دن امتحان دینے کے لئے جراحت خانہ میں آئے تو ان کے سامنے ایک ایسی عورت کا سر لایا گیا جو کچھ ہی دیر پہلے انتقال کر گئی تھی اور ممتحن مرحوم علامہ ڈاکٹر علی پاشا ابراہیم تھے جو مشہور جراح ہونے کے ساتھ

---

(۱) ناجی حیاته وشعره ص ۴۹

بہترین ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور ایک نامور فنکار بھی تھے۔

استاد نے تمام شاگردوں سے پوچھا کیا تم لوگ اس مریض کے مرض کی تشخیص کر سکتے ہو؟ طالب علم شک میں پڑ گئے اور کوئی جواب نہیں دیا تو استاد نے کہا ناجی! تعجب ہے تم پر تم تو شاعر ہو اس کے چہرہ اور آنکھوں کو دیکھو۔ شاعر عورت کے چہرہ کو غور سے دیکھنے لگے تو دیکھا کہ اس کے چہرہ پر عجیب سا پیلا پن نمایاں ہے مگر اس کے باوجود اس کا چہرہ پر رونق ہے اور اس میں کشش باقی ہے اور اس کی پلکیں بھی دوسری عورتوں کے مقابلہ میں بڑی ہیں۔

ناجی نے مریضہ کی اس کیفیت بالخصوص اس کے پیلا پن کو دیکھتے ہوئے بتایا یہ عورت دق کی بیماری سے مری ہے۔ استاد خوش ہو گئے اور کہا اے ناجی مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی اور ناجی امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔[1] اس واقعہ کے بعد ناجی کی شہرت عام ہونے لگی کیونکہ ناجی نے بحیثیت شاعر مریضہ کو دیکھا تھا۔ اسے شاعری میں اتنا کمال حاصل تھا کہ اس نے مرض کی بھی تشخیص کر لی۔

شخصیت:-

ناجی بہت ہی نرم دل اور فیاض انسان تھے۔ سخاوت اور دریا دلی میں ان کی شہرت عام تھی۔ ان کے پاس اگر کوئی مفلوک الحال اور پریشان شخص آتا جسے علاج کرانے کی استطاعت نہ ہوتی تو آپ اس سے پیسہ کا مطالبہ نہ کرتے تھے۔ ان کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسے مریضوں کو دوا خریدنے کے لئے اپنے

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی۔ مسعود الکیالی ص ۸۲۹

جیب سے پیسے دیتے تھے اور اگر عمدہ غذا نہ ملنا مرض کا سبب ہوتا تو اس کا بھی انتظام کر دیتے۔ اسی طرح جب اہل علم اور ارباب قلم میں سے کوئی بیمار پڑتا تو یہ لوگ علاج کے لئے ناجی سے ہی رجوع کرتے۔ ناجی کے اس قسم کے بے مثال حسن سلوک اور ہمدردانہ رویّے سے تمام لوگ متاثر تھے جسکی بنا پر ان کے مطب میں ہمیشہ مریضوں کا ہجوم لگا رہتا۔

ناجی ایک سلیم الطبع، رقیق القلب اور با اخلاق انسان تھے۔ سادگی اور رقت پسندی ان کے فطرت کی شان تھی۔ ان کی شاعری کا ہر مصرعہ اور ان کی زندگی کے تمام حرکات و سکنات میں یہی رقت پسندی اور سادگی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کے نغمہ سے بھی ان کے سادہ دلی کی ترجمانی ہوتی ہے۔

درگذر اور حسن اخلاق بھی ناجی کے اخلاق کا بہترین پہلو ہے۔ انتقام اور بغاوت ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ ان کے مخلص دوست صالح جودت رقمطراز ہیں۔" کان لا یعرف الثورہ لانہ کان سریع التسامح و الصفح فی سھولۃ الصفح عندہ اسرع من الکلام یبدو فی عینیہ قبل ان یبدو علی لسانہ"[1]

ابراہیم مصری ناجی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔" اگر تم ناجی سے ملو گے تو خوشی محسوس کرو گے۔ تمہارے دل کو بادِ نسیم کی ٹھنڈک محسوس ہوگی اور اگر تم ان سے مصافحہ کرو گے تو وہ تمہارے لئے اپنے دل کو کھول دیں گے اور اگر تم ان کی مصاحبت میں بیٹھو گے تو تمہیں محسوس ہوگا کہ میں

---

(۱) ناجی حیاتہ و شعرہ ص ۵۲

ایک متحیر القلب آدمی ہوں۔ اور اگر تم ان کی باتیں سنو گے تو تمہیں ان کے دل کی صفائی خوش کر دیگی اور ان کی عظیم شخصیت کے سامنے تم کو اپنی شخصیت کا لعدم محسوس ہوگی۔(۱)

حلیہ :-

قدرت کا ازلی فیصلہ رہا ہے کہ اس نے کسی بھی بشر کو من کل الوجوہ جامع الکمالات نہیں بنایا ہے۔ صرف واحد اسی کی ذات ہے جو المستجمع لجمیع صفات الکمال ہے۔

ناجی اگرچہ علوم وفنون میں نابغہ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے مگر قدرت نے انھیں جمال ظاہری سے محروم رکھا تھا۔ ان کے چہرے میں نہ وہ کشش اور خوبصورتی تھی اور نہ ہی جسمانی ساخت میں توانائی اور مضبوطی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی محبت میں ناکامیاب ہوئے جو ان کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔ وہ زندگی بھر پیار و محبت کی پیاس میں مختلف عورتوں کے در پہ دستک دیتے رہے مگر ہر جگہ ناکامی ہی ان کا مقدر بنتی رہی۔ جسکی وجہ یہ تھی کہ عورتوں نے ان کو محبت کے لائق نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ صالح جودت کہتے ہیں۔

"وذالک لان بناءہ الضئیل وقامتہ القصیرہ وملامحہ الساذجۃ لم تکن توحی الی صواحبہ بانہ فتی الاحلام او تقنعھن بانہ الرجل المرجو"(۲)

عمر کے اخیر حصہ میں زازا نامی ایک عورت نے جو ابراہیم ناجی

---

(۱) ناجی حیاتہ وشعرہ ص ۵۲

(۲) نفس مصدر

شاعری سے متاثر تھی نے ان سے اپنی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھوایا۔ جو ناجی کی وفات کے بعد الطائر الجریح میں شائع ہوا۔ جس کے چند ابتدائی اشعار یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔

انا وحدی فی البید حیران هائم

فمتی تذکر القفار الغمائم

رحمة یا سماء ان فمی

جف وحلقی عن الموارد صائم

غاض نبع المنی ولم یبق حتی

ومضة الحلم فی محاجر نائم

ایها الطاعم الکری ملء جفنیه

ه وجفنی من الکری غیر طاعم

ابکنی واستبد بی واقض ماشا

ء لک الحسن فی واظلم وخاصم (۱)

جب ہم قریب سے ناجی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ دو بار حادثوں سے دوچار ہوئے ایک بار محبت میں ناکام ہوکر اور دوسری بار اس وقت جب ان کا دیوان "وراء الغمام" زیور طباعت سے آراستہ ہوکر سامنے آیا۔ اور ڈاکٹر طہ حسین کی تنقید ان کی نظر سے گزری۔ اس وقت ناجی لندن میں

---

(۱) ناجی حیاته وشعره ص ۱۳۱

تھے۔ طہٰ حسین کی تنقید بہت سخت تھی۔ اسے پڑھ کر ناجی کے دل و دماغ پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہوگئی۔ غور و فکر کی صلاحیت جاتی رہی۔ وہ سڑک پر نکل آئے اور خانہ بدوشوں کی طرح پھرنے لگے۔ ایک دن جب وہ اسی طرح سڑک پر خانہ بدوشوں کی طرح چکر پر چکر لگا رہے تھے۔ ایک کار سے ان کی ٹکر ہوگئی جسکی وجہ سے ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی اور انھیں ہاسپٹل میں داخل کر دیا گیا وہاں علاج کرا کر اور صحتیاب ہو کر وہ وطن واپس لوٹے۔ اب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے البتہ ادب سے تعلق برابر قائم رکھیں گے۔[1]

ادبی سرگرمیاں :-

ابراہیم ناجی کے تین دواوین ہیں "وراء الغمام" "لیالی القاھرہ" اور "الطائر الجریح" اس کے علاوہ بہت سے قصائد ہیں جو مختلف مجلات میں شائع ہوئے۔ اگر ان کو اکٹھا کیا جائے تو ایک دیوان تیار ہو سکتا ہے۔

ابراہیم ناجی نے شاعری کے علاوہ مقالات بھی لکھے ہیں افسانے بھی تحریر کئے ہیں۔ مختلف محفلوں اور جلسوں میں لکچر بھی دیئے ہیں۔ ان کی یہ تحریریں مختلف جرائد اور مجلات میں منتشر ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

مشکلات العصر الحدیث

الشعر العربی الحدیث

سیکولوجیہ الادب

---

(۱) تاریخ الشعر العربی الحدیث، احمد قبش ص ۲۴۷

الوعی الادبی

حیاۃ شکسبیر وعصرہ

فولتیر

برغنسون

المدینۃ

سیکولوجیۃ المرأۃ

الغرائز الجنسیۃ

الضمیر

الاقدار

عن توفیق الحکیم. (فی مجلۃ الحدیث)[1]

اس کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں۔

مثلاً مدینۃ الاحلام۔

فی فن القصۃ اسے مجموعۃ کتب للجمیع نے ادرکنی یا دکتور کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

ترجمہ دولیستوفوسکی کے ناول کا بعنوان "الجریمۃ والعقاب" ان کی بعض غیر مطبوعہ تحریروں کا بھی سراغ ملتا ہے وہ یہ ہیں۔

عالم الاسرۃ

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۳۹

کیف تفہم الناس

رسالۃ الحیاۃ (۲ جلدوں میں)

قراءات احبتہا

الحب والجنس

ازھار الشر

اھازیج شکبیر

رباعیات ناجی (۱)

۱۹۳۲ء میں جب ڈاکٹر ابو شادی کے ہاتھوں ابولو تحریک کی بنیاد پڑی تو ناجی اس تحریک کے ممبر بنے اور ابولو میگزین میں ان کے قصائد چھپنے لگے۔ جب یہ تحریک ختم ہوگئی تو انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ایک ماہنامہ رسالہ "حکیم البیت" نکالا۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی۔

۱۹۴۴ء میں ابراہیم دسوقی اباظہ کے قائم کردہ "جامعۃ ادباء العروبۃ" کا احیاء کرکے "رابطۃ الادب الحدیث" قائم کی جس کے پورے عالم عرب بلکہ مستشرقین بھی اراکین تھے۔ اور ادبی نشستوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

(۱) عام تعلیمیافتہ لوگوں کو ادبی ثقافت بہم پہنچانا

(۲) ادب کے فنون واقسام میں تجدید کی ہر دوڑانا، خاص طور سے شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور تنقید و ادب میں جدت پیدا کرنا۔ اور دوسرے معتبر ادبی ذخیروں

---

(۱) دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۴۸ - ۴۴۹

کی ہمت افزائی کرنا۔

(۳) ادیبوں اور شاعروں کے کاموں کے ساتھ انصاف کرنا اور مصر و عالم عربی میں افسانہ نگاری کو ترقی پذیر بنانا۔

(۴) جدید ادب اور اس کے اساطین کے کارناموں کو غیر جانبداری سے اجاگر کرنا۔

(۵) سال میں تین کانفرنسیں منعقد کرنا جس میں ادب اور معاصر شعر کے رجحانات اور شعری مجموعوں کا جائزہ لیا جانا۔

(۶) رابطہ کے اراکین کی نگارشات کو اس کی ادبی کمیٹی کی موافقت کے بعد شائع کرنا اور ایک سالانہ کتاب مرتب کرنا جس میں کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات اور رپورٹ شامل ہوں۔(۱)

۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی وفات کا عربی ادب پر بڑا اثر ہوا۔

احمد رامی اور حسن کامل صیرفی نے ان پر طویل مرثیہ لکھا ہے۔

احمد رامی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ایھا الراحلون عنا سلاما

قد صحونا وما ظلمتم نیاما

اصبح الصبح والخواطر حیری

کیف بتم یا ساکنین الرغاما

---

(۱) تاریخ الشعر العربی الحدیث، احمد قبش ص ۴۴۸ - ۴۹

صاحب بعد صاحب يتوارى

في صباه وليسبق الاياما

وحبيب الى، كان معى

بالامس الطيف وذابت انفاسه انغاما (١)

---

(١) ناجى حياته وشعره ص ١٣٢

تحریک اپولو اور اس کے اثرات عربی شعر و شاعری پر

تاسیس و مقاصد:

تحریک اپولو کی بنیاد تحریک دیوان (۱۹۲۱) اور رابطہ قلمیہ (۱۹۲۰ – ۱۹۳۱) کے بعد مذکورہ سیاسی و سماجی حالات میں ڈاکٹر احمد زکی ابو شادی (۱۸۹۲ – ۱۹۵۵) نے ۱۹۳۲ء میں رکھی۔ حالانکہ یہ تحریک بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ۱۹۳۵ء میں ہی اس کا خاتمہ ہوگیا لیکن اس مختصر مدت میں ہی اس کے گہرے اثرات عربی زبان و ادب پر مرتب ہوئے۔ اور اس کے شعراء نے نئی راہ نکالنے اور نئے اسلوب و طرز فکر کو پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔

اس جماعت کے مقاصد بہت زیادہ تو نہیں تھے لیکن وہ مقاصد ہمہ گیر ضرور ہیں۔ احمد زکی ابو شادی نے اس کے ترجمان "اپولو" کے پہلے شمارے میں صرف اس کے تین مقاصد بیان کئے ہیں۔

(۱) عربی شاعری کو رفعت و بلندی عطا کرنا اور شعراء کی کوششوں کی بہترین توجیہ۔

(۲) شعری دنیا میں فنی ارتقاء اور بیداری کی پرزور مدد کرنا۔

(۳) ادبی، اجتماعی یا مادی لحاظ سے شعراء کے معیار کی بلندی اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت و دفاع کرنا۔ (۱)

---

(۱) الشعر المصری بعد شوقی: ڈاکٹر محمد مندور ص ۱۲۴

تیسری دہائی کے مصری سیاسی پس منظر کے پیش نظر یہ تحریک شکوک وشبہات کا پیش خیمہ بن گئی اور اس وقت کے شعراء وادباء کا عام نظریہ یہ تھا کہ اس کے دلفریب مقاصد کے پس پردہ اس کا بنیادی مقصد ادب کی عزت وناموس کی پامالی ہے۔

اس خیال کو طہ حسین (م ۱۹۷۳ء) اور عقاد (م ۱۹۶۴ء) نے ناجی کے پہلے دیوان "وراء الغمام" پر سخت تنقید کرکے اور پختہ ومؤکد کر دیا۔(۲) لیکن آگے چل کر یہ سب خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے بلکہ وہی ادب کی عزت وناموس کی نگہبان بن گئی اور اس سے منسلک شعراء نے عربی زبان وادب خصوصاً شاعری کی اتنی زیادہ خدمت کی اور اسے اتنی وسعت بخشی جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تحریک ابولو کی خصوصیات :-

تحریک دیوان تحریک رابطہ قلمیہ کے بعد عربی شاعری مستقل ارتقاء کے منازل طے کرنے کے لئے محو سفر رہی، مقلدین شعراء اور دیوان گروپ کے درمیان جاری کشمکش اگرچہ کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ کر سکی۔ اور دیوان گروپ اپنی ہزارہا خصوصیات کے باوجود آخر کار ناکام ہوگیا اور اس کے علمبردار اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے شاعری کے میدان کو ہی

(۱) قصائد مجہولۃ : حسن توفیق ص ۷۳

خیرباد کہہ دیا، دوسری طرف رابطۂ قلمیہ بھی زیادہ دنوں تک اپنا جادو نہ جگا سکی اور تاریخ کے صفحات کا ایک حصہ بن گئی۔ لیکن ادب کے ارتقاء کے سلسلے میں ان کی پیش کردہ کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور ان سابقہ تحریکات کی راکھ سے ایک نئی چنگاری ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلہ جوالہ بن گئی جسے دنیا "تحریک ابولو" کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی شکل میں عربی شاعری میں ایک نیا دھارا پیدا ہوا۔ ایک نئے رخ کا ظہور ہوا کہ اس نے سابقہ تحریکات کو سامنے رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ اس نے نہ دیوان گروپ کی طرح مکمل جدیدیت کا نعرہ بلند کیا اور ماضی سے یکلخت رشتہ توڑنے کی دعوت دی اور نہ ہی قدامت پسندوں کی طرح اپنے اسلاف اور قدیم شاعری کے معیار کو برقرار رکھنے اور اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کی قسم کھائی۔ بلکہ اس نے زمانہ کے تقاضہ کو سامنے رکھتے ہوئے قدیم عربی زبان وادب کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے جدیدیت کو بھی گلے سے لگایا اور ان دونوں کے امتزاج سے عربی شاعری کا ایک حسین وجمیل بت تراشا جو ایک طرف قدیم طرز کا شاہکار تھا تو دوسری طرف جدید کا سرگرم رکن بھی تھا اور ایسا شعری سرمایہ ہمارے حوالے کیا جو قدامت کی چھاپ کے موجود ہوتے ہوئے بھی جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور جدید شاعری کے معیار پر مکمل طور سے اترتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مندور "اس جیسی تحریک کا غلغلہ سرزمین مصر سے آج تک نہ اٹھ سکا۔"(۱)

---

(۱) الشعر المصری بعد شوقی: ص ۱۲۳

تحریک ابولو کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیوان گروپ اور دیگر تحریکات کی طرح علاقائی نہیں بلکہ عالمی تحریک تھی جو کسی محدود شعری وادبی مکتبۂ فکر کی نمائندگی نہیں کرتی تھی[1]۔ جس کے موسسین کے پیش نظر ایک عالمی کینوس تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی کی مناسبت سے اس تحریک کا نام "ابولو" رکھا جو قدیم اغریقی زبان میں شعروادب کا خدا کہلاتا تھا، جس کی بازگشت بہت جلد سارے عالم عرب میں سنائی دینے لگی اور لوگوں نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور انہیں اس کے جلو میں اپنی امیدوں کے پورا ہونے کی کرن نظر آئی لہذا شعراء وادباء کی ایک کثیر تعداد جس میں ابراہیم ناجی علی محمود طہ جیسے شعراء بھی شامل ہیں، جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ اور اس کی دعوت سے سوڈان، حجاز، عراق، فلسطین، اردن، جزائر اور دیگر عرب ممالک کے شعراء متاثر ہوئے بقول عبداللطیف شرارہ اگر ان ممالک کے شعروادب پر اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معاصر عربی ادب کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔[2]

---

(۱) الشعر المصری بعد شوقی: ڈاکٹر محمد مندور ص ۱۲۴، اس کی سب سے بڑی دلیل اس کے قائد ابوشادی کا شعری سرمایہ ہے جو ہر موضوع وصنف کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور الادب العربی المعاصر از شوقی ضیف ص ۷۳-۷۲ اور فصول فی الشعر ونقدہ از شوقی ضیف ص ۹۵-۳۹۴ اور قضایا جدیدۃ فی ادبنا الحدیث از ڈاکٹر محمد مندور ص ۹۸-۹۶۔ ڈاکٹر محمد مندور کہتے ہیں کہ اگرچہ اس پر وجدانی پہلو غالب تھا لیکن اس (بقیہ اگلے صفحہ)

اس جماعت کا خاکہ ابراہیم ناجی نے اپنے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔" اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ مدرسہ الپولو کا تعلق اور اس کے جدید افکار کی اتباع، عربی شاعری میں تجدد کی روح پھونکنے اور اس کے اغراض و مقاصد میں وسعت پیدا کرنے اور اس کے فرائض کو محدود کرنے پر ایمان بالکل ایک انسانی عمل کے مانند ہے۔ اور وہ ایسے ایک جماعت کی طرح ہے کہ مشرق کے نوجوان ادباء جس کے چھت تلے جمع ہوتے ہیں بے شک مدرسہ الپولو نے بہت جلدی ادباء کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ کیونکہ وہ فن کی طلاقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ارکان کے فنی تجربات کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس جیسی تحریکات کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی حدود و قیود کی پابندی کے وہ عربی شاعری کو پروان چڑھاتی ہے۔"(۱)

---

(۱) مقومات الشعر العربی الحدیث ص ۲۴۶

ص کا حاشیہ: نے کبھی بھی اسے اپنا مذہب بنا کر پیش نہیں کیا۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: جماعۃ الپولو واثرہا فی الشعر الحدیث از عبد اللطیف شرارہ اور الشعر الجزائری فی الحدیث از ڈاکٹر محمد ناصر ص ۱۰۹-۱۱

اس جماعت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقلدین اور جدید شعراء دونوں ہی کے خیال و افکار سے باغی تھی۔ ادبی ٹھیکیداری اور ادب کی اونچی اونچی دوکانوں کی ہمیشہ اس نے مخالفت کی[1] اور کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ منقود کون ہے؟ جس سے تنقید کے میدان میں کافی وسعت پیدا ہوئی[2]۔

اس جماعت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اسم بامسمی ثابت کیا اپنے نام کے لحاظ سے اس کے لئے فطری بات تھی کہ وہ تمام شعری مذاہب و مناہج کا خیال رکھے جسمیں وہ مکمل طور پر کامیاب بھی ہوئی کہ اس کے جلو میں ہمیں ذوق قدیم کے حامل شعراء جیسے احمد محرم، محمد اسمر، توفیق بکری، احمد زینی، زکی مبارک، خلیل شیبوب وغیرہ جو بالعموم عربی قصیدہ کی تقلیدی شکل کے محافظ و قائل تھے، اعتدال پسند، انتہا پسند جدید شعراء اور بھجری شعراء شانہ بشانہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عہد جدید کے مقلدین شعراء کی طرح جماعت نہیں تھی جس نے قدیم کے اصول کو سینے سے لگانا ضروری سمجھا اور نئی نسل کے جدید شعراء کی طرح

---

(۱) المجلہ ۱۹۶۱ء: ص ۱۵۴

(۲) العلوم ۱۹۶۸ء، ص ۵۹

بھی نہیں تھی جس نے ان پر تنقید کرنا اپنا اولین فرض سمجھا۔[1] بلکہ اس نے ان دونوں کے درمیان ایک نئی معتدل راہ اختیار کی اور شعر و ادب کے دامن کو اپنے بہترین ادبی سرمایہ سے مالا مال کر گئی۔

اس کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ترجمان "ابولو" کے صفحات پر مغربی شعراء کی تخلیقات کے تراجم پیش کئے۔ ان کے ادبی مذاہب کو واضح کیا، ان کے بعض نمونے نقل کئے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بہترین تصویر کشی کی۔ جس سے نئی نسل کے ادباء و شعراء مغربی ادب و افکار سے واقف ہوئے جس نے جدید عربی ادب کی ارتقاء میں کافی اہم کردار ادا کیا۔[2]

مذکورہ تمام خصوصیات کے مقابلے میں۔ ہماری نظر میں۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نوجوان نسل کے شعراء و شاعرات کو خصوصی اہمیت دی۔ ان کی ہمت افزائی کی اور بہت سے شعراء کو گمنامی کے قعر سے نکال کر شہرت و بلندی کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا ہم بطور مثال ابو القاسم شابی کو پیش کر سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کی بازگشت اور شہرت کا آغاز اس کے مجلہ میں چھپنے کے بعد ہی ہوا۔[3] مجلہ ابولو نے پہلی بار اپنے چند صفحات عورتوں کی تخلیقات کے لئے مخصوص کر دیا تھا ان کی ہمت افزائی کی اور ان کے مختصر کوائف

---

(۱) فصول فی الشعر و نقدہ : شوقی ضیف ص ۲۹۴

(۲) الادب العربی المعاصر : شوقی ضیف ص ۷۱

(۳) قصائد مجہولۃ : حسن توفیق ص ۶۹

کے نوٹ ان کی نگارشات وتخلیقات کو شائع کیا جس کے نتیجہ میں بہت سی شاعرات پروان چڑھیں جو بقول حسن توفیق "ابولو کا ایک اہم امتیاز ہے"۔[1]

تحریک ابولو کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے پیش رو تحریکات کے شعراء خصوصاً شمالی مہجری شعراء کی شاعری کو سامنے رکھا[2] اور اس سے استفادہ کیا، نتیجہ میں اس کا شعری افق بہت زیادہ وسیع ہوگیا تھا جس نے وجدانی شاعری[3]، رومانی شاعری[4] اور آزاد شاعری[5] کو پروان چڑھانے میں بہت زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔

تحریک ابولو کا ترجمان "ابولو" اور اس کے اثرات عربی زبان وادب پر:-

تحریک ابولو نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اپنا ترجمان ابولو کے نام سے شائع کیا جس کے مدیر اس تحریک کے بانی وسکریٹری اور جدید عربی شاعری کے روح رواں احمد زکی ابوشادی تھے۔ یہ ستمبر ۱۹۳۲ء سے دسمبر ۱۹۳۴ء

---

(۱) قصائد مجہولۃ، حسن توفیق ص ۷۰

(۲) نفس مصدر ص ۶۹

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے. قضایا جدیدۃ فی ادبنا الحدیث: ڈاکٹر محمد مندور ص ۹۵-۹۸

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے. مقومات الشعر العربی الحدیث: محمود شوکت ص ۲۵۶-۵۸

(۵) تفصیل کے لئے دیکھئے. جماعۃ ابولو واثرھا فی الشعر الحدیث اور ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث۔ جسمیں اس کے مصنف کمال نشات نے مجلہ ابولو میں شائع ہونے والے آزاد شاعری کے قصائد کا جائزہ لیا ہے۔ مزید دیکھئے. قصائد مجہولۃ ص ۷۲

تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کے صرف ۲۵ شمارے منظر عام پر آئے۔[1] لیکن اس نے اپنے گہرے اثرات عربی زبان و ادب خصوصاً شاعری پر چھوڑے ہیں۔

مجلہ ابولو کے پہلے شمارے میں ہی اس کا نام موضوع بحث بن گیا۔ اور اس کے نام پر عقاد نے اس کے پہلے شمارے میں ہی تنقید کی اور اس کا نام عطارد رکھنے کی تجویز پیش کی کیونکہ وہ ابولو کے مقابلے میں زیادہ وسیع مفہوم لئے ہوئے ہے لیکن احمد زکی ابوشادی نے اسی شمارے میں اس تجویز کو قابل اعتبار نہ سمجھا بلکہ انھوں نے عقاد کی اس تجویز کی مخالفت کی اور دلائل سے "ابولو" نام کو زیادہ قابل اعتبار گردانا اور اسے اس کے نام پر ہی برقرار رکھا۔[2]

ابولو ایک جامع اور بہترین مجلہ تھا جس کے صفحات ادب و نقد کے لئے بھی حاضر رہتے تھے لیکن اس کا بنیادی مقصد شعر و نقد شعر کی نشر و اشاعت تھا۔[3] اسی لئے عبدالعزیز دسوقی نے اسے شاعری کے لئے مکمل طور پر مخصوص پہلا مجلہ قرار دیا ہے۔[4] چنانچہ اس کے صفحات پر ہمیشہ ایسے قصائد شائع ہوتے رہے جو تجدید کے سلسلے میں ایک جماعت کے مزاج کے مطابق اور

---

(۱) العلوم ۱۹۶۸ء ص ۵۹

(۲) مقومات الشعر العربی الحدیث و المعاصر: ص ۱۳۷-۳۸

(۳) الشعر المصری بعد شوقی: ڈاکٹر محمد مندور ص ۱۲۶

(۴) العلوم: ۱۹۵۸ء ص ۵۹

اسکی چھاپ لئے ہوتے تھے باوجود اس کے کہ مجلہ ابولو کے صفحات ہر قسم کے اور ہر نقطۂ نظر کے شعراء کے لئے حاضر تھے لیکن اس میں شائع ہونے والے قصائد پر رومانی پہلو غالب تھا۔ اس کے ایمان کی بنیاد یہ تھی کہ شعر کو دل کی دھڑکنوں فکر کے گوشوں، جذبات واحساسات کو بہترین الفاظ میں دلآویز اسلوب نئے اور انوکھے خیال کی شکل میں پیش کرنے کا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اس نے پرانی تعبیرات سے اپنے دامن کو خالی کر لیا تھا اور انوکھی زبان کو ترجیح دی۔ تاکہ الفاظ معانی کا ساتھ دے سکیں۔(۱)

مجلہ ابولو کا سب بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کے جوان سال ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی کاوشیں صفحات کی زینت بنتی رہیں اور اس نے بہت سے شعراء کو شہرت و دوام بخش دی اور انھیں آسمانِ شعر و ادب کے چمکتے ستاروں میں شامل کر دیا۔ بطور مثال ہم تیونس کے مشہور شاعر ابوالقاسم شابی کو پیش کر سکتے ہیں جنکی شہرت کا آغاز ان کے مشہور قصیدہ "صلوات فی ھیکل الحب" سے ہوا جو سب سے پہلے ابولو کے صفحات کی زینت بنا تھا۔(۲)

مجلہ ابولو کے صفحات ۔ اس تحریک کے عالمی مقصد کے پیش نظر۔ ہر قسم کے مکتبۂ فکر اور ہر علاقہ کے شعراء کے لئے کھلے ہوئے تھے جس نے اپنے اوپر گروہ بندی کا لیبل نہیں لگایا تھا۔ اور اس نے اس تحریک کی اصلاحی

---

(۱) فصول فی الشعر و النقد : شوقی ضیف ص ۱۳۹ اور عمر دقاق : الاتجاہ القومی ص ۴۰۱

(۲) قصائد مجہولۃ ص ۶۹

کوششوں کے مقاصد کے حصول کے لئے ہر مددگار کے لئے اپنے صفحات وا کر رکھے تھے ہمیں اس ترجمان میں اس تحریک کے نمائندوں کے علاوہ رافعی، عقاد (جدید شعراء) ایلیا ابوماضی، شفیق معلوف و ریاض معلوف (شعراء مہجر) ابوالقاسم الشابی (تیونس) جواہری و ظریفی (عراق) احمد محجوب، عبداللہ عبدالرحمٰن، توفیق احمد بکری (سوڈان) کے قصائد و فکری کاوشیں ملتی ہیں۔[1] جن کے شانہ بشانہ ہمیں پہلی بار اس کے صفحات میں شاعرات کے قصائد و اشعار بھی اس کی زینت بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جنمیں مشہور شاعرہ و ناقدہ ڈاکٹر سہیر قلماوی کے علاوہ جمیلہ علایلی، رباب کاظمی، اقبال بدران، زینب سلیم اور سنیۃ عقاد وغیرہ شامل ہیں۔[2] اسی طرح اس کے شماروں میں آزاد شاعری کے معروف ہونے سے پہلے ہی مختلف قصائد البوشادی وغیرہ کے شائع ہوتے رہے جنھوں نے آزاد شاعری کی راہ ہموار کرنے میں کافی اہم رول ادا کیا۔[3]

---

(۱) ڈاکٹر محمد مندور نے تقریباً ۶۶ شعراء کے نام گنائے ہیں جن کے اشعار اس میں شائع ہوتے رہے ہیں جو مختلف مکتبۂ فکر و مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تلاش و جستجو کے بعد اس فہرست میں مزید اضافہ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ دیکھئے الشعر المصری بعد شوقی ص ۶۲۶ ۲۷

(۲) قصائد مجہولۃ ص ۷۰

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے قصائد مجہولۃ ص ۷۰-۷۲۔ ان قصائد کا جائزہ کمال نشات نے البوشادی و حرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث میں لیا ہے۔

مجلہ ابولو کے صفحات پر انگریزی و فرانسیسی تخلیقات کے تراجم، انگریزی و فرانسیسی شعراء کے حالات اور ان کے شعر و ادب کے جائزے مغربی ادب و افکار وغیرہ شائع ہوتے رہتے تھے۔ جنھوں نے عربی زبان و ادب کو وسعت عطا کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اس طرح عربی زبان اور دیگر زبانوں کے درمیان جو خلیج تھی اس کو ختم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر محمد مندور اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس تحریک اور اس کے ترجمان نے مصر میں ایک عام شاعرانہ فضا پیدا کردی تھی۔ جو صرف قدیم عربی شاعری کی نمائندگی پر ہی مشتمل نہیں تھی بلکہ اس میں غیر عربی آداب سے استفادہ و تاثر کے رجحانات بھی کچھ اس طرح ملتے ہیں کہ اس کے اثرات ان شعراء پر بھی مرتب ہوئے جو مغربی زبان سے بالکل نابلد تھے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مجلہ نے عربی شعر و شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دینے، نئے طرز اسلوب کی بنیاد ڈالنے، وجدانی، رومانی، رمزی اور آزاد شاعری کو پروان چڑھانے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جس کے اثرات سے اس زمانے کے شعراء ـ خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقہ سے ہو ـ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جسکی اشاعت کو شوقی ضیف نے عالم عربی میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش قرار دیا ہے۔[2]

---

(۱) الشعر المصری بعد شوقی : ڈاکٹر محمد مندور ص ۱۲۹

(۲) فصول فی الشعر و نقدہ ص ۱۳۸

جماعت ابولو کی شاعری پر تبصرہ :-

تحریک ابولو کے شعراء کے سامنے اصحاب النھضۃ جیسے شوقی، جدیدیت کے علمبردار جیسے عقاد، مھجری شاعری جیسے ایلیا ابو ماضی اور لبنان میں پروان چڑھنے والی رومانی شاعری کے نمونے تھے۔ ان سب کے علاوہ ان کے سامنے مغربی ادب کے تراجم بھی تھے لیکن انھوں نے مکمل طور پر کسی ایک کو بھی گلے نہیں لگایا تاہم انھوں نے امریکی یعنی شمالی مھجری شعراء کے نمونوں سے زیادہ استفادہ کیا جس کے اثرات ان کی شاعری پر ملتے ہیں۔(۱)

انھوں نے ان تمام شعری سرمایوں کو سامنے رکھ کر اپنی راہ متعین کی جو عربی شاعری کے سرمایہ میں بہترین اضافہ کا سبب ثابت ہوئی۔ اور انھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے اس کے دامن کو مالامال کردیا۔(۲)

شعراء ابولو نے اپنی مخصوص طرز فکر سے عربی شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ نت نئے تجربات کئے۔ نئے اور دلآویز اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنے جذبات و احساسات، خیالات و افکار کو محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے عربی شاعری کا ایک نیا اور حسین و جمیل بت تراشا اور اس کے قدموں میں اپنی انتہائی درجہ کی صلاحیتوں کوششوں اور کاوشوں کے خوبصورت پھول نچھاور کئے۔

---

(۱) قصائد مجہولۃ ص ۶۹

(۲) فصول فی الشعر ونقدہ ص ۲۹۵

اور اس کی نگاہوں میں کچھ اس طرح سرخرو ہوئے کہ ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر عربی شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ۔ بقول : "س موریة" اس مدرسہ نے مہجری شعراء کی طرح تجربات نقل کرنے کے لئے رموز و اشکال کا سہارا لیا ۔ اس کا پیش کردہ شعری و نثری ادب نے اسلوب کی سادگی کی ۔"(۱)

جب ہم اس جماعت کے شعری سرمایہ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں مختلف اصناف سخن و اقسام شاعری نظر آتی ہیں ۔ جنھیں ہم مندرجہ ذیل میلانات اور رجحانات میں تقسیم کرسکتے ہیں ۔ (۱) عاطفی میلانات (۲) فکری میلانات (۳) وصفی میلانات (۴) اجتماعی میلانات (۵) انسانی میلانات ۔

۱۔ عاطفی میلانات :۔

اس جماعت کے شعراء نے مندرجہ بالا تمام رجحانات و میلانات پر قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے ۔ خصوصاً عاطفی میلانات ان کی شاعری میں بہت زیادہ نمایاں حیثیت کی حامل ہیں ۔ اس زمانہ کے پس منظر میں ان جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے لئے اس سے اچھا پیرایہ بیان ممکن نہ تھا ہمیں ان کے اس شاعری میں ایک خاص قسم کی تڑپ و پیاس ، احساسِ ضیاع ، عورت کے صفاتِ کی تصویر کشی ، یادگار چیزوں سے لازوال محبت ، ذاتی تجربات کی تصویر کشی میں مبالغہ اپنے آپ میں سمٹ جانا ، داخلی احساسات و جذبات اور عواطف و جذبات کی تصویر کشی ایسے انداز اور ایسے اسلوب میں ملتی ہے ۔

---

(۱) الشعر العربی الحدیث : س. موریة تودیب : ڈاکٹر سعد مصلوح اور ڈاکٹر شفیع سید ص ۲۳۳

جس میں زندگی کی تڑپ اور لگن محسوس ہوتی ہے ۔ ان کے اس شعری سرمایہ کے جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل و دماغ میں موجود حزن و غم، الم و مصیبت، محبت و خواہشات کے سارے جذبات کی مکمل ترجمانی رومانی شاعری نہ کر سکی ۔ لہذا انھوں نے رمزیت کا سہارا لیا اور اس سہارے سے اپنے دلی جذبات کو پیش کرتے رہے ۔ اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کے اکثر شعری سرمایہ پر انفرادی وجدانی اور رمزی تعبیرات کا پہلو غالب ہے ۔[1]

اس ضمن میں ہم ظلام و نور، عودہ اور المیعاد : ناجی جیسے قصائد بطور مثال پیش کر سکتے ہیں ۔

۲ ۔ فکری میلانات : ۔

اس سے مراد ان کے فلسفیانہ اور صوفیانہ اور علمی اشعار ہیں ۔ لیکن اس سے مراد وہ اشعار نہیں ہیں جو فلسفیانہ علمی اور صوفیانہ نظریات کو متون کی طرح نظم کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں ۔ بلکہ ان سے مراد وہ اشعار ہیں جو ان اشیاء سے متصل ان کے خواطر و جذبات کو الہامی شکل میں پیش کرتے ہیں ۔ اور وہ انھیں ایک ایسے شاعرانہ انفعالی کیفیت کے ساتھ نظم کرتے ہیں کہ وہ علم کی حدود سے نکل کر عواطف و جذبات کے دائرے میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ اور احساسات کو پروان چڑھاتے ہیں ۔

اس ضمن میں المھجر : الوشادی، الحیاۃ : ناجی، لبقرۃ الحی:

---

(۱) العلوم ۱۹۶۸ء : ص ۵۹

محمود حسن اسماعیل اور الراھب المتمرد : صالح جودت وغیرہ کے قصائد پیش کئے جاسکتے ہیں۔

(۳) وصفی میلانات :—

اس ضمن میں ان کے وہ قصائد پیش کئے جاسکتے ہیں جو انھوں نے فطرت کی تعریف و توصیف میں کہے ہیں۔ ان قصائد میں انھوں نے فطرت کو اپنی محبوب ماں سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسکی گود میں سر رکھ کر اپنے سارے حزن و غم کو بیان کردیا ہے۔ اور اس کی گہرائیوں اور گیرائیوں میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس کے اسرار و رموز سے واقف ہوسکیں۔ اور اس کی روح سے فیضیاب ہوسکیں ہم اس ضمن میں جوان سالی میں وفات پانے والے شاعر محمد عبد المعطی ھمشری کے قصائد کو پیش کرسکتے ہیں جو اس پہلو کے بہترین نمائندہ قصائد ہیں۔

(۴) اجتماعی و انسانی میلانات

اجتماعی و انسانی میلانات میں انھوں نے معاشرتی، سماجی اور انسانی پہلوؤں کی بہترین نشاندھی کی ہے۔ لیکن اس قسم کے ترجمانی کرنے والے قصائد کی تعداد بہت کم ہے۔(۱)

اس جماعت نے قصیدہ کی شکل، اس کے مضمون اور شعر کے پیغام میں جو تجدید کی ہے ہم اسے تین کالموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: العلوم ۱۹۶۸ء : ص ۵۹-۶۰

(۱) فنی بناء کی تجدید یا قصیدہ کے خارجی شکل کی تجدید: اس سے مراد قصیدہ کی خارجی شکل یعنی بحور، قوافی، اشکال اور نئے نئے اوزان میں پیدا شدہ تجدید ہے۔

(۲) داخلی بناء کی تجدید میں افکار، شعری جذبات واحساسات کی نظم وتنسیق اور قصیدہ کی داخلی وخارجی شکل میں مناسبت کی رعایت کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ عمل فنی کو مکمل اجزاء اور مناسب شکل ومضمون میں اس کی فنی وحدت کو پیش کرسکے۔ اس چیز کا سہارا لے کر انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔

(۳) شعری پیغام: اس سے مراد ان کے اشعار کے مقاصد اور اجتماعی افکار کی وضاحت ہے ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک محدود مقصد وھدف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں اجتماعی، وطنی، قومی اور انسانی اقدار کی وافر مقدار نظر آتی ہے۔ تاہم ان کی شاعری کے پیغام کو اس زمانہ کی بہترین تصویر کشی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم محمد عبد المعطی ھمشری "شاطی الاعراف" اور علی محمود طہ کے "میلاد شاعر" کو بطور نمونہ پیش کرسکتے ہیں۔ جو ان کی تجدید کے معالم اور ان کے شعری پیغام کے خدوخال کو مکمل طور پر واضح کرتے ہیں۔(۱)

اس جماعت کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالعزیز

---

(۱) العلوم: سنہ ۱۹۶۸ء ص ۶۱-۶۲

دسوقی رقمطراز ہیں۔" شعراء ابولو قصیدہ کی وحدت بیان کی آزادی فنی طلاقت، ادبی شخصیت کی آزادی، نئے اور اچھوتے خیال کو پیش کرنے، اغراض ومناسبات سے دور رہنے۔ جس میں تقریباً ساری عربی شاعری گرفتار ہے اور زمانہ کے ترجمانی کی دعوت دیتے ہیں۔ لہذا ہم ان کے اشعار میں زندگی کی حرارت ورقت پاتے ہیں۔ جو فنی طلاقت اور بیان کی آزادی لئے ہوئے اور اس میں گہرے وجدان کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی شاعری میں مغربی طریقوں اور موضوعات کو جرأت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اور انسانی روح کی پسندیدہ چیزوں کو موضوع سخن بناتے ہیں۔ نتیجے میں ایسی شاعری وجود میں آتی ہے جو گہرے خواب لئے ہوئے ہوتی ہے ان کے اشعار گھنے سائے روشنیوں، مختلف رنگوں ونغموں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان میں پھولوں کے الحان، ساحرانہ وادیوں کی سرگوشیاں اور ستاروں کا رقص پایا جاتا ہے۔"(۱)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شعراء ابولو نے شاعری کے آفاق پر کمندیں ڈال دیں۔ اور ہر قسم کے موضوعات کو متنوع سخن بنایا۔ لیکن ان کی شاعری کا امتیاز ہم انفرادی وجدان اور رمزی تعبیر کو قرار دے سکتے ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے شعراء نئے نئے اور اچھوتے خیال پیش کرنے میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئے اور عربی شاعری کو ایک ایسا بلند مقام ومرتبہ عطا کر

---

(۱) العلوم ص ۵۹

جس تک وہ اس سے پہلے نہیں پہنچ سکی تھی۔ بقول سحرتی کی کتاب کے تبصرہ نگار کے جماعت ابولو نے بالکل نئے پیرایہ بیان میں اپنے عاطفی و وجدانی اشعار کو پیش کیا جس سے نہ تو جدید کلاسیکی جماعت جیسے شوقی وحافظ اور نہ ہی عقاد و مازنی جیسے جدید شاعری کے علمبردار واقف تھے۔(۱)

تحریک ابولو کے اثرات عربی زبان و ادب پر:-

تحریک ابولو تحریک دیوان اور رابطہ قلمیہ کی راکھ سے پروان چڑھی تھی۔ اس کے سامنے اپنے پیش رؤوں کے شعری تجربات تھے جن سے اس نے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا اور عربی شعر و شاعری میں نت نئے تجربات کر کے اپنے گہرے اثرات عربی زبان و ادب خصوصاً عربی شاعری پر مرتب کئے کہ عربی شاعری کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر ناقص رہے گی۔

جماعت ابولو بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کے علمبرداروں کو اپنی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہوئی نظر آئی۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ فن کی راہ میں ان کی تجدیدیت اور آزادی کی جدوجہد رائیگاں جا رہی ہے کہ اس کے پیغام و صدا پر بہت کم لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی بدنصیبی یہ بھی تھی کہ ان کی ساری کوششیں مضطرب سیاست کے بحر بیکنار میں مل جاتی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس پر سخت ترین

---

(۱) المجلہ سنہ ۱۹۶۱ء، ص ۱۵۴

اور مہلک حملے کئے گئے حتی کہ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں ابوشادی نے ابولو کو بند کرنے اور عام زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح یہ جماعت اپنے دردناک انجام کو پہنچ گئی لیکن کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کوششیں بالکل ہی رائیگاں گئیں؟

اس جماعت کے دردناک انجام اور مکمل طور پر کامیاب نہ ہونے کے باوجود اس کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ یہ جماعت عربی شعر و شاعری کے (خزاں رسیدہ) چمن میں ایک بہار بن کر آئی اور بہار کے جھونکے کی طرح گذر بھی گئی لیکن ہماری ادبی زندگی کو معطر کر گئی اور اس کے دامن کو خوشبوؤں سے بھر دیا۔ یہ ایک تحریک تھی جس نے ہماری معاصر شاعری میں بہت سے جمالیاتی و فنی اقدار کو پیدا کیا۔[1] ان کے شعری مضامین وجدانی شاعری طبعی شاعری، صوفیانہ شاعری اور فلسفیانہ شاعری کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے شعری قوالب جمود کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قوافی اور بحروں میں نت نئے تجربات کرتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی قوافی کی حدود کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ ان کے شعری سرمایہ میں قصص، ڈرامے کی مختلف انواع و اقسام ملتی ہیں۔ ان نظریات و میلانات کے پیش نظر تحریک ابولو نے معاصر عربی شاعری میں ایک زبردست جدید قسم کا شاعرانہ دھارا تیار کر دیا تھا جو متعدد شعری افکار کی وجہ سے ممتاز ہے۔[2]

---

(۱) العلوم ص ۶۱

(۲) نفس مصدر ص ۵۹

اس جماعت کے اثرات سے سارے عرب ممالک کی شاعری متاثر ہوئی اور ہر ممالک کے شعراء و ادباء اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے دیگر ممالک کی شاعری پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معاصر ادب کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

جماعت ابولو ہی کی تاثیر سے رومانی تحریک بہت جلد عرب ممالک میں پھیل گئی۔[1] وجدانی شاعری کی ابتداء اگرچہ شعراء مہجر نے کی تھی لیکن یہ دعوت مکمل اور وسیع پیمانے پر جماعت ابولو کے فضل سے عام ہوئی۔[2] جس نے نوجوان شعراء پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے خصوصاً ابراہیم ناجی کی شاعری اس تحریک کی بہترین نمائندگی کرتی ہے اور ابراہیم ناجی اس اونچائی پر نظر آتے ہیں جہاں دوسرے شعراء نہیں پہنچ پاتے ہیں۔

عبد العزیز الدسوقی اباظہ ناجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ان ناجی بلغ الذروۃ فی التعبیر عن ظمأ الروح و اللھفۃ الخالدۃ الی الحب۔ وعاش طوال حیاتہ روحا ظامئا۔ یبحث عن العواطف ولیعبر عن الشواقہ المتدفقۃ۔ وامتد ھذا الظمأ و الحنین فی شعرہ حتی آخر حیاتہ وفی دواوینہ نلمح ناجی المتعطش الی الحب یمثل تیار ابولو اصدق تمثیل[3]

(۱) العلوم ص ۱۳۹-۴۱

(۲) قضایا جدیدۃ فی ادبنا الحدیث، ص ۹۵ ومابعد

(۳) جماعۃ ابولو ص ۴۲۵

تحریک اپولو کے ممتاز شعراء

احمد زکی ابو شادی کی ولادت ۹ر فروری ۱۸۹۲ء کو قاہرہ میں ہوئی۔ ان کے والد محمد ابو شادی ایک وکیل اور مشہور مقرر تھے۔ جنھیں وطن سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ والدہ امینہ شاعرہ تھیں اور شاعر مصطفی نجیب کی بہن تھیں۔ اس طرح انھوں نے شاعرانہ ماحول اور ادبی فضا میں آنکھیں کھولیں۔ ابو شادی نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم قاہرہ میں حاصل کی۔[1] سن شعور کو پہنچتے ہی تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ روزنامہ "الظاہر" اور ہفت روزہ رسالہ "الامام" (جسے ان کے والد نکالتے تھے) میں ان کے مقالات شائع ہوتے صرف سولہ سال کی عمر میں ان کی پہلی کتاب "قطرۃ من یراع فی الادب والاجتماع" منظر عام پر آئی۔ جو ادبیات اور سماجیات سے متعلق مقالات و منظومات پر مشتمل تھی۔[2]

اپریل ۱۹۱۲ء میں ان کے والد نے انھیں طب پڑھنے کی غرض سے انگلینڈ بھیجا۔ جہاں انھوں نے دسمبر ۱۹۱۵ء میں اپنی تعلیم مکمل کرلی اور علم الجراثیم میں وہاں "وب" کے انعام سے نوازے گئے۔ سات سال تک وہ اس میدان میں سرگرم عمل رہے اور اس دوران انھوں نے شہد کی مکھیوں۔

(۱) تطور الادب الحدیث فی مصر ص ۲۹۹

(۲) جدید عربی شاعری: نسیمہ فاروقی ص ۱۹۷-۹۸

متعلق ایک سوسائٹی بنائی اور ایک رسالہ عام النحل کے نام سے جاری کیا۔ شعرگوئی کے علاوہ اپنے ذوق مصوری کو بھی آگے بڑھایا۔ یورپ میں انھیں انگریزی اور دوسرے مغربی ادب کو پڑھنے کے مواقع ملے۔ خاص طور پر رومانی رجحان کا گہرا مطالعہ کیا۔ انھیں خلیل مطران، شیلی اور کیٹس کی شاعری بہت پسند آئی کیونکہ ان لوگوں کے یہاں وجدانی کیفیت موجود تھی۔ ابوشادی نے وہاں پر عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے "جمعیۃ آداب اللغۃ العربیۃ" کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی نیز "النادی المصری" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس میں اپنے وطن کے لوگوں کو جمع کرتے اور اپنے ملک کے حالات پر غور و خوض کرتے اسکی وجہ سے پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔ اور انھیں وہاں سے وطن واپس آنا پڑا۔[1]

وطن واپسی کے بعد اپریل ۱۹۲۳ء میں انھیں "علم الجراثیم" کی ادارت سونپ دی گئی۔ ایک سال بعد سوئز تبادلہ ہوگیا پھر بالترتیب پورٹ سعید اور اسکندریہ میں رہ کر ۱۹۲۸ء میں قاہرہ واپس آگئے۔ اس دوران انھوں نے چھ علمی و ادبی انجمنوں کی بنیاد ڈالی۔ جماعۃ الپولو، جماعۃ الادب المصری، مملکۃ النحل، رابطۃ الادب الجدید، الاتحاد المصری لتربیۃ الدجاج، جمعیۃ الدجاج اور جمعیۃ الضاعات الزراعیۃ۔[2] جن میں جماعت الپولو کو سب سے زیادہ

---

(۱) اعلام النثر والشعر ج ۲ ص ۱۹۷

(۲) احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید ص ۲۴-۲۵

شہرت حاصل ہوئی۔ اور عربی ادب پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔
اس جماعت کا بنیادی مقصد عربی شعر و شاعری کو رفعت و بلندی عطا کرنا تھا۔ تاکہ
عالمی ادبیات میں اس کو ایک مقام حاصل ہو۔ اس تحریک سے والبسط شعراء نے
اس کے اثرات کو قبول کیا اور ابراہیم ناجی بھی اس تحریک سے بے پناہ متاثر ہوئے
ابراہیم ناجی نے فکر عربی کی تحریکات پر اس جماعت کے اثرات اور اس جماعت پر ابوشادی
کے اثرات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ نومولود مدرسہ جسے
ابوشادی مصر میں بلند کر رہے تھے اور ایک حد تک انگریزی ثقافت سے متاثر ہو کر
اس کی قیادت کر رہے تھے۔ بے شک العقول نے اپنی انتھک کوششوں سے
اس مدرسہ کو پروان چڑھایا۔ اس کے علم کو بلند کیا۔ شعراء کو روشنی دکھائی
عربی شاعری کے افق میں وسعت پیدا کی۔ اور اس کے ذریعہ اسے بھاری بھرکم قیود
سے آزاد کر دیا۔"(۱)

جب یہ تحریک ختم ہوگئی اور اس کا ترجمان رسالہ بھی بند ہوگیا
العقول نے "الامام" اور "الادبی" کے نام سے دو رسالے نکالے۔ لیکن دونوں جلد ہی بند ہو
گئے۔ اس کے بعد وہ اسکندریہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوگئے۔ ۱۹۴۶ء
میں ان کی بیوی "سانده و وفرت" کا انتقال ہوگیا تو وہ اپنے دوستوں کے مشورے
سے امریکہ چلے گئے۔ اور وہیں کی سکونت اختیار کرلی۔ لیکن وہاں بھی ان کی علمی
وادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رسالہ الھدی، الاصلاح، السائح اور

---

(۱) مقومات الشعر العربی الحدیث والمعاصر ص ۲۲۸

"نھضۃ العرب" میں برابر لکھتے رہے۔ اور امریکہ ریڈیو سے برابر اپنے خیالات نشر کرتے رہے۔

ابوشادی اپنی ان گوناگوں مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ان کے متعدد دواوین ہیں۔ جنمیں "انداء الفجر" ۱۹۱۰ء، "زینب" ۱۹۲۴ء، "مصریات" ۱۹۲۴ء، "انین و رنین" ۱۹۲۵ء، "الشفق الباکی" ۱۹۲۷ء، "عودۃ الراعی" ۱۹۴۲ء بہت مشہور ہیں۔

ابوشادی کی شاعری میں گرچہ بیک وقت رومانیت، رمزیت اور واقعیت کے اثرات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی ان کی شاعری میں رومانیت کا غلبہ رہا ہے۔ انھیں رومانی شاعر بنانے میں خود ان کی زندگی، مصر کے پرآشوب سماجی حالات اور سب سے بڑھ کر ان کی ناکام محبت محرک ثابت ہوئی ہیں۔ محبت کی پہلی شکست نے ان کے خوابوں اور آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ وہ اپنی محبوبہ زینب کو اسی کے نام سے موسوم دیوان میں مخاطب کرتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زینب ما احلی الخفوق الذی — لا یرحم القلب لدی قربک
زینب یا روحی وریحانتی — ما شئت ما شئت هو صبک
زینب یا شمس یا بهجتی — کونی کعهد الشمس فی حبک
کونی السنا والهدی والمنی — للحائر الرانی الی طبک
کونی أیا ملکی غایة — للطهر تدنینی الی ربک

حسبی و وجدانی وکلی الفد للاکمل الاجمل من دآبک

ان عشت لم ینسخ صلاتی النوی او مت ناجانی هو شربک (۱)

ان اشعار میں سادگی و بیساختگی اور خیالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ہمیں سچے جذبات و احساسات اور عواطف کا احساس ہوتا ہے فطرت کی طرف بھاگتے ہوئے وہ رومانی منہج کی پیروی کرتے ہیں۔ جب محبت کا ٹکراؤ سخت ترین عذاب سے ہوتا ہے اور جب وہ اپنے احساسات و جذبات سے پریشان ہو اٹھتے ہیں۔ ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے اور ان کا تصور کیجئے۔

سربت فلسفنی من نبع آلای وقبلها عب منه قلبی الدای

وما برحت اغنی من اخرا ابدا کان الام قلبی لسن آلای

کان دمعی اناشید قد احتبست حتی تراق علی قدی الغامی (۲)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ترمذی ابوشادی کی شاعری پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"ابوشادی کا اسلوب شاعری ان کے دور کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں محبت کی کسک، طبیعت کا جمال ہے۔ فکر کی لطافت اور نفس کی سچی تصویر کشی ہے۔ رومان ان کی طبیعت میں بھی تھا اور عملی زندگی میں بھی۔

---

(۱) مقومات الشعر العربی الحدیث والمعاصر ص ۲۵۱

(۲) عربی شاعری کے جدید رجحانات ص ۸۵-۸۶

مثال کے طور پر ان کا ایک شعر۔

هيفاء ينبض بالملاحة جسمها

فتر الحبات من الثياب تعطل [1]

---

(۱) عربی شاعری کے جدید رجحانات ص ۸۴

علی محمود طہ

علی محمود طہ ۱۹۰۲ء میں مصر کے ایک شہر "منصورہ" میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اسکول میں داخل کر دیئے گئے اور کم عمر میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرلی۔ ثانوی کے بعد انھوں نے مدرسہ "الفنون التطبیقیۃ" میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انجینئر بن کر نکلے۔ زندگی کا بیشتر حصہ ملازمت میں گذرا اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی ملازمت کی زیادہ تر مدت آبائی وطن میں گذری منصورہ اور اس سے متصل شہروں میں مختلف جگہوں پر ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔

علی محمود طہ کا گھر ادیبوں اور فنکاروں کا مرکز تھا۔ اپنے گھر میں انھوں نے ایک لائبریری قائم کی جو "مکتبہ منصورہ" کے نام سے معروف ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ۴۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

علی محمود طہ کا خاندان بڑا متمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں آلام ومصائب سے دوچار نہیں ہونا پڑا اور زندگی کے کسی بھی مرحلے میں مایوسی اور محرومی کی تلخیوں کو محسوس نہیں کیا۔ ان کی زندگی ہمیشہ باغ و بہار رہی، متمول اور خوشحال ہونے کی وجہ سے زندگی عیش و آرام سے گذری۔ لہذا زندگی حقائق، معلومات اور تجربات سے خالی تھی۔ زندگی ملازمت ہی کی چہار دیواری میں محصور رہی۔ انجینئرنگ کے پیشے سے بھی انھیں دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری رنگ و شباب اور فرح و انبساط کا ذخیرہ ہے۔

علی محمود طہ نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ ۱۵ سال کی عمر سے ہی ان کے کلام مختلف رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ علی محمود طہ اس گروہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے "ابولو" تحریک میں حصہ لیا اور ان کے قصائد برابر مجلہ ابولو میں شائع ہوتے رہے۔

ان کا پہلا دیوان "الملاح التائہ" ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آیا اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی دواوین شائع ہوئے۔ انھوں نے شعری زندگی کا آغاز "لامرتین" "شیلی" اور "فردوی غینی" کے فرانسیسی قصائد کے ترجمہ سے کیا ہے۔ وہ اپنے شہر میں ایک خوش مزاج انسان کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنی شاعری میں ایک لذتیت سے اپنے کو بہلاتے رہے۔ ان کے یہاں کوئی معنوی حسن زیادہ نہیں ہے۔ مگر ترنم، روانی اور حسن الفاظ کا ایک جادو ان کے کلام میں ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں آزادی کا احساس ہوتا ہے رومانیت کا غلبہ ہے جس سے عقل متاثر نہیں ہوتی مگر دل ضرور متاثر ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنا اللیل مھیا — یا ربۃ الاحلامی

دعانا ملک الحب — الی محرابہ اسامی

تعالی فالدجی وحی — اناشید واحلامی (۱)

ان کے قصائد "الجندول" "فلسطین" "کلیو باترا"

---

(۱) عربی شاعری کے جدید رجحانات ص ۸۸-۸۹

اور "لیالی کلیوباترا" جنھیں عظیم موسیقار عبد الوھاب نے گایا ہے بہت مشہور ہیں۔ ان میں بے پناہ نغمگی اور سریلا پن ہے۔

عبد المعطی ہمشری

عبد المعطی ہمشری کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں دقھلیہ کے ایک قدیم شہر سنبلاوین میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کلیۃ الآداب (آرٹس فیکلٹی) میں داخلہ لیا۔ لیکن تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ وزارت زراعت میں بحیثیت کاتب ملازمت کا آغاز ہوا۔ ہمشری تحریک رومانیت سے کافی متاثر تھے اور ان کے بہت سے قصائد رومانی شاعری میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد مندور نے اس کی رومانی شاعری پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ "شاعر اپنی فطرت اور حالات زندگی سے رومانیت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اسکی رومانیت میں کسی قسم کے تکلف اور تصنع کو دخل نہیں ہے۔ یہ رومانیت اس کے دل کی گہرائیوں کی عکاسی ہے۔ جس طرح یورپ کے مشاہیر رومانی شعراء میں یہ فن بالکل فطری نظر آتا ہے اسی طرح اس کے اندر بھی یہ فن فطری ہے۔"(۱)

محمد عبد المعطی نے اپنے اشعار میں ماضی کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ بالخصوص بچپن کی یادوں کو دہرایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے قصیدہ "النارنجۃ الذابلۃ" کو کافی شہرت ملی ہے۔ اس ضمن میں اور بھی بہت سے قصائد ہیں مثال کے طور پر ان کا قصیدہ "العودۃ" جس میں انھوں نے

---

(۱) اعلام النثر والشعر ص ۱۶

گاؤں سے شدید محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔

رجعت الیک الیوم من بعد غربتی وفی النفس آلام تفیض تواتر

رجعت وعقلی تائہ الفکر شارد وابت وقلبی واھن القلب خائر

فیا ارض احلامی التی طفولتی ولیعدنی یوم من العمر آخر (۱)

ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حمشری رمزی شاعری سے بھی کسی حد تک متاثر تھے مثال کے طور پر ان کا مشہور قصیدہ "الی چنا الفاتنۃ" جس میں رمزی اور عاطفی شاعری مخلوط نظر آتی ہے۔

ھا ھو اللیل قد اتی فتعالی تھادی علی ضفاف الرمال

فنسیم المساء لیسرق مطرا من ریاض سحیقۃ فی الخیال

صور الغرب الذکی رباھا فھی تحکی مدینۃ الاحلام

نفحت فی الخیال منھا زھور غیر منظورۃ من الاوھام

ووراء السیاج زھرۃ فل غازلتھا اشعۃ فی المساء

نشر النسم سرھا وھو یسری فی مروج مطلولۃ الافیاء

ودھالیز من ظلال ونور صورت سحرھا ید الاطیاف

عششش البلبل الخیالی فیھا ساکبا لحنہ الحنون الصافی (۲)

اس کے مذکورہ بالا قصیدہ پر عبد العزیز الدسوقی ان الفاظ میں تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ "جماعۃ ابولو کے معاصر شعراء جنھوں نے

---

(۱) اعلام النثر والشعر ص ۲۰۱

(۲) جماعۃ ابولو واثرھا فی الشعر الحدیث، ص ۲۱۴

عربی شاعری کو نئی روح اور ایسے الفاظ تحفے میں دیئے ہیں جن سے عربی شاعری کی لغت مانوس نہیں تھی۔ یہ قصیدہ اس کا بہترین نمونہ ہے۔[1] وہ مزید کہتے ہیں" اس کے بیشتر قصائد میں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ شاعری میں جدید الفاظ کے انتخاب اور نئے ماحول کی تخلیق پر قادر ہیں۔[2]

عبدالمعطی اپنی عمر کا تیئس سال بھی مکمل نہ کر پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ وفات آپریشن کے بعد دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔

شاعر نے اگرچہ اپنے شباب ہی میں دنیا کو خیرآباد کہہ دیا انھوں نے علم وادب کا وہ بہترین نادر تحفہ اہل قلم کے لئے چھوڑا ہے کہ رہتی دنیا ان کا نام روشن رہے گا۔ عبدالمعطی ھمشری ابراہیم ناجی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ ان کی وفات پر ناجی اپنے جذبات کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

لاتجزعوا للشاعر الملھم ما مات لکن صار فی الانجم

ما کان الا زائر عابرا لای سر جاء لم نعلم

کان فراشا حائرا فی الدنی فی نورھا او نارھا یرتمی

فان نجا من نارھا مرۃ فمن لھیب النفس لم یسلم[3]

---

(۱) جماعۃ الپولو واثرھا فی الشعر الحدیث ص ۴۱۶

(۲) نفس مصدر ص ۴۱۴

(۳) قصائد مجھولۃ ص ۳۶

مصطفیٰ عبد اللطیف سحرتی

مصطفیٰ عبد اللطیف سحرتی ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء میں "میت غمر" میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں قرآن کریم کی چند سورتیں یاد کر لی تھیں۔ ابتدائی تعلیم میت غمر کے ایک مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں L.L.B کی ڈگری حاصل کی اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس کا سفر کیا لیکن پیرس پہنچ کر قانون پیرادب کو ترجیح دیکر سوربون یونیورسٹی میں ادب میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران صحافت سے بھی منسلک رہے۔

پیرس سے واپسی کے بعد ادب اور صحافت میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے اور "السیاسۃ الاسبوعیۃ" میں مختلف ادباء اور مفکرین کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ ان میں سقراط وجیتہ سعدی شیرازی، تولستوی، روسو، منفلوطی اور ابن خلدون وغیرہ ہیں۔

سحرتی کا شمار جید ناقدین میں ہوتا تھا۔ عربی نثر میں اس کا اسلوب بہت بہترین تھا۔ جس میں شگفتگی، معنی کی گہرائی، اور ان کا جمال نمایاں تھا۔ مگر ان کے مخلص دوست ابوشادی نے ان کو شعر گوئی پر مجبور کیا اور بار بار اس کی ترغیب دیتے رہے۔ جس کے نتیجہ میں سحرتی شاعری کی طرف مائل ہوئے۔

ایک جگہ ابوشادی نے ان کی شاعری پر یہ تبصرہ پیش کیا ہے۔

" سحرتی کی شاعری میں ناجی کے پر جوش عواطف، صیرفی کے رموز، سحراوی کے خیالات، صالح جودت کی موسیقی، شابی کی وجدانی کیفیات، شربا صی کے اوصاف اور سنوسی وجہنی کی روانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کا ایک خاص موسیقی آزاد اسلوب، صوفیانہ طرز اور انسانیت سے بھرپور جذبات وعواطف ہیں اس لئے ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ سحرتی نئے مکتب فکر کے ایک فطری شاعر ہیں۔"(۱)

سحرتی نے ۱۹۳۴ء سے شعر کہنا شروع کیا اور اسی سال وہ جماعت الپولو سے متعارف ہوئے۔ پھر الوشادی سے گہرے روابط ہو گئے ۱۹۳۷ء میں ان کی کتاب " ادب الطبیعۃ " شائع ہوئی۔

ان کا قصیدہ " ازھار الذکریٰ " بہت ہی مشہور ہے جسمیں بہترین اسلوب کی نمائندگی ہوتی ہے۔

حظیت بالزھر من حنانہ — وصیری الدمع علی الوجہ الصبیح
وتھادت ترسل النظرہ حیری — تطلب السلوان من رب صفوح
والثیاب البیض تخفی سرھا — ودموع الحزن بالسر ینوح
مالھذا الزھر ما ینفعنی — ھل یرد الزھر میتا او یریح
لیس ریاہ سوی تعریہ — لفواد مسہ شجو جریح
ھو انفاس لارواح ثوت — وھو بالسلوی حقیق ان یفوح

---

(۱) جماعۃ الپولو واثرھا فی الشعر الحدیث ص ۱۶۶

عطره يملأ آفاق الورى　　سره المكنون للارجاء روح

فانشري الازهار يا صاحبتي　　وانشر الذكر على ذاك الضريح (۱)

سحرتی اصلاً رومانی شاعر ہیں لیکن انھوں نے رمزیت کو بھی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر قصیدۃ الفراشۃ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

تطرف بالورد

تهدي له السرا

وتشرب القبلات

من خده الغض

وترشف الالوان

من قطرة الانداء

في صحرة الفجر (۲)

---

(۱) اعلام النثر والشعر ص ۲۱۱

(۲) عربی شاعری کے جدید رجحانات ص ۱۰۲

حسن کامل الصیرفی

حسن کامل الصیرفی ۶ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو دمیاط شہر میں پیدا ہوئے۔ بہت ہی کم عمر میں جبکہ وہ ۱۵ر سال کے بھی نہیں تھے شعر گوئی میں حصہ لینے لگے۔ ثانوی درجہ میں ہی حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے تعلیمی سلسلا ۱۹۲۵ء میں منقطع کرنا پڑا۔ لیکن شعر و ادب کے لئے ذاتی محنت و مطالعہ کو جاری رکھا اور ۱۹۲۸ء کو وزارت زراعت میں ایک معمولی ملازمت اختیار کی اور یہیں ۱۹۴۲ء تک کام کرتے رہے۔ بالآخر اسی وزارت میں پارلیمنٹ کے سکریٹری کے عہدہ تک پہنچے اور جب وزارت ارشاد نے اپنا ماہنامہ رسالہ "المجلۃ" جاری کیا تو حسن کامل کو اس کا امین التحریر مقرر کیا۔[1]

انھوں نے اپنا پہلا دیوان "الحان الضائعۃ" ۱۹۴۲ء میں نکالا۔[2] جس کے مختلف قصیدوں میں نفسانی کیفیات، وجدانی احساسات مشقتوں اور پریشانیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کا قصیدہ "الواحۃ المنسیۃ" بہت مشہور ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے غم و حزن کو پیش کرنے کے لئے رمزیت سے مدد لی ہے وہ کہتے ہیں۔

فی ذمۃ الفن الحان تضیع و فی اصداثھا قطع من قلب فنان

---

(۱) اعلام النثر و الشعر ص ۱۱۷

(۲) نفس مصدر

تجرع الالم الدامی فحوله　　الی ترانیم عشاق والحان

لیسقی العذاب ولیسقی الناس اکؤسهم　　صفوا من النور فی ظلماء اشجان

مدامع الانجم الحیری تشارکه　　تسلسل الدمع فی اجفان حیران

وظلمة اللیل تستوحی کآبته　　همس السکون باقصاح وتبیان

ومطلع الفجر یستوحی ابتسامه　　نور الملائک فی اشواق انسان

اناته من طعان الدهر صادرة　　وجرحه من شظایا العالم الجانی

تضمد الجرح کفاه ولیسترہ　　بواضح من ثنایا الثغر نتان (۱)

احمد زکی ابو شادی حسن کامل الصیرفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔ "شاعر مبتدع بعید الخیال رومانطیقی النزعۃ غالبا، رمزی احیانا، بعید فی طورہ الحاضر عن المثل القدیمۃ، لغتہ لغۃ الشعر الحرّ، فکل الفاظہ اشعۃ وظلال و انغام واصداء وعطر وشذی واشباح واطیاف ونحوھا۔" (۲)

ان کے بعض قصائد میں تصوف کی بھی جھلک ملتی ہے مثلاً قصیدہ "الحیاری" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قد سبحنا بالفکر عندک یارب　　فتاهت ارواحنا فی سمائک

وشدونا ما قد شدونا ولکن　　ضاع هذا جمیعه فی فضائک

---

(۱) جماعۃ اپولو ص ۴۰۶

(۲) نفس مصدر ص ۴۰۰

وعرفنا من الخیال معا فیہ وغابت عنا معانی جلائک[1]

۱۹۳۵ء میں "نشید الثورۃ" (بغاوت کا ترانہ) لکھا جس میں وہ کہتے ہیں۔

ولا تقل السیوف سیوف خصمی ولا تقل المدافع فوق غری

واوجد من غرائمک السیوفا واشعل نارھا واثر لظاھا[2]

۱۹۴۸ء میں ان کا دوسرا دیوان "الشروق" شائع ہوا۔ اس دیوان کو انھوں نے اپنی بیوی (اھداء) کی طرف انتساب کیا جو ان کے مخلص دوست ابوشادی کی رشتہ دار تھیں اور احمد زکی ابوشادی نے ہی شاعر کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔

۱۹۴۸ء کے بعد بہت سے قصائد شائع نہیں ہوسکے۔ ان کے دیوان حسب ذیل ہیں۔

قطرات الندی، دموع ازھار، رجع الصدی، حول النور[3]

جن کو انھوں نے اکٹھا کرکے ۱۹۶۰ء میں "صدی ونور ودموع" کے نام سے شائع کیا۔[4]

---

(۱) اعلام النثر والشعر ص ۱۷۳

(۲) نفس مصدر

(۳) نفس مصدر

(۴) نفس مصدر

حسن کامل کو مرثیہ گوئی میں بھی کافی دسترس تھی، انکی والدہ، علی محمود طہ، احمد زکی ابو شادی اور بھی دیگر اشخاص کے مرثیے قابل ذکر ہیں۔ حسن کامل ایک مجدد شاعر تھے لیکن جن نقادوں نے ان کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "وہ مہجری شعراء سے متاثر ہیں" غلط ہے کیونکہ وہ خود ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنا دیوان "الحان الضائعہ" مہجری شعراء کے مطالعہ سے پہلے مرتب کیا ہے۔(۱)

ڈاکٹر محمد مندور حسن کامل الصیرفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حسن کامل الصیرفی نے شعر کے موضوعات اس کی روح اور موسیقی میں بہت عمدہ تجدید کی ہے۔ گرچہ انھوں نے تجدید کا ارادہ نہیں کیا

آگے کہتے ہیں" یقینا یہ عظیم شاعر اپنے مستحق ادبی مقام سے محروم ہیں۔ ان کے اور بھی چار دیوان ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئے ہیں۔ عربی ادب کے تمام شعراء کے مابین مرثیہ گوئی میں ان کا مقام ممتاز ہے۔"(۲)

AZAD LIBRARY A.M.U.
DS- 2958

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: اعلام النثر والشعر ص ۱۷۹

(۲) نفس مصدر

ابراہیم ناجی

بحیثیت شاعر

جدید عربی شاعری میں جس رجحان کا اثر بڑی شدت سے رہا ہے وہ ہے رومانوی رجحان حتیٰ کہ تجدد پسند شعراء کا سارا سرمایہ ان کی رومانیت پسندی ہی ہے۔ موجودہ صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں اس رجحان کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ ان دونوں دہائیوں میں مصر نے ظالم ترین حکام کا سامنا کیا۔ جنھوں نے مصر کی ترقی کے ہر دروازے خصوصاً عربی شعر و شاعری پر قدغن لگا دیئے تھے۔ آزاد ادباء کے خلاف زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ چنانچہ بہت سے شعراء اپنے آپ تک محدود ہو گئے۔ ضرنیہ نغمہ گنگنانے لگے اور اسے انھوں نے اپنے اردگرد کے فطری ماحول اور اپنے دل میں برپا ہونے والے احساسات کو محبت کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ اس رجحان کے اظہار میں جن شعراء کو عالم عربی میں سب سے زیادہ شہرت ملی ان میں سے ایک ابراہیم ناجی ہیں۔

جدید عربی ادب میں ابراہیم ناجی کی اپنی ایک شناخت ہے۔ وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ کی وجہ سے اپنے معاصرین شعراء میں ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری خالص رومانوی شاعری ہے۔ یہ ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے مصر میں مایوسی، بدشگونی، بدبختی اور تکالیف کی بہترین نمائندگی کی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے حقائق خصوصاً عشق و محبت، پیار و وجدان کو ہمارے سامنے ایک نئے رنگ و روپ میں پیش کرتی ہے۔

ابراہیم ناجی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء فرانسیسی رومانی

شعراء سے متاثر ہوکر کی۔ اس کے نتیجہ میں ان کی شاعری وجدانی ہونے کے ساتھ ساتھ رومانی پرور جذبات کی فراوانی سے معمور ہے۔ لہذا اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ انھوں نے مغربی رومانی شاعری کے دو اہم ستون الفردی موسیہ اور لامرتین کے مجموعوں "التذکار" اور "البحیرۃ" کا ترجمہ کیا ہے۔ رومانی شاعری کی بہت زیادہ سسکتی بلکتی تصویر خاص طور پر الفردی موسیہ کے "التذکار" میں نظر آتی ہے۔

لی نزوع الی الدموع الھوامی　　غیر انی اخاف من آلامی
ابھذا المکان یا غالی الترب　　دمثوی عبادتی واحترامی (۱)

اور لامارتین کے قصیدہ کا ترجمہ "البحیرۃ" ہمارے سامنے اس رومانی پرور شاعری کے سحر و جادو نگاری کی ایک نئی راہ پیش کرتا ہے۔

من شاطی لشواطی جدد　　یدمی بنالیل من الابد
ما قدمتہ فلم یعد　　ھیھات مرسی برھۃ للغد (۲)

ڈاکٹر احمد ھیکل نے "الرومانتیکیۃ الغنائیۃ" میں ناجی کے مقام و مرتبے کو متعین کرتے ہوئے لکھا ہے" اذا امکن ان یعتبر احمد زکی الوشادی داعیۃ تلک المدرسۃ فلیس من شک فی ان ابراھیم ناجی کان من اھم عمدھا وارفع ھاماتھا۔ فشعر ناجی یمثل تلک المدرسۃ" الروما

---

(۱) مقومات الشعر الوی الحدیث و المعاصر. ص ۲۵۲

(۲) نفس مصدر

تتكلية الغنائية" اروع تمثيل، وناجي يتعلق بين شعراء تلك المدرسة كما يشمخ العقاد بين شعراء المدرسة" التجديدية الذهنية" وكما يضئ شوقي بين شعراء المدرسة" المحافظة البيانية"(۱)

(جس طرح البوشادی کے اس جماعت کے داعی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اسی طرح ابراہیم ناجی کے اس جماعت کے ایک بہترین ستون اور علمبردار ہونے میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ابراہیم ناجی کی شاعری رومانی غنا کے مکتبہ فکر کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ رومانی مکتبہ فکر میں ناجی کا وہی درجہ ہے جو تجدد پسند مکتبہ فکر میں عقاد کا اور قدامت پسند مکتبہ فکر میں شوقی کا ہے۔)

سوال یہ اٹھتا ہے کہ ابراہیم ناجی کی شاعری بلندی و رفعت کے اس مقام پر کیسے پہنچی کہ انھیں عقاد و شوقی کے ہمسر و ہم پلہ قرار دیا جائے؟ جب ہم اس سوال کے جواب کے لئے حیات ناجی کے درخشندہ اوراق کو پلٹتے ہیں تو ہمیں اس کا جواب مل جاتا ہے اور اس بات پر یقین ہو جاتا ہے کہ قدرت جس سے جو کام لینا چاہتی ہے اسی حساب سے اس کے اسباب و عوامل اکٹھا کئے جاتے ہیں اور اسی حساب سے اسکی نشو و نما و پرداخت کا انتظام کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر احمد ھیکل آگے رقمطراز ہیں۔" ان طبیعة الناجی ونشاة

---

(۱) دراسات ادبیة، ص ۱۶۴

وظروف حياته قد ساعدت جميعا على دفعه الى هذه الاتجاه "الرومانتيكي الغنائي" حتى سبق فيه غيره. اما طبيعة الرجل فكانت طبيعة شديدة الشفافية مفرطة الحساسية فيها كثير من الانطواء الحزين والحياء المغالب. وكل ذلك من طبيعة الرومانتيكيين واما نشأة ناجي فقد كانت نشأة فيها صقل وتهذيب، بين بيئة ذات طابع روحي يوشك ان يكون تصوفيا وذات تقليد اجتماعي يكاد يكون انفصاليا. ثم وهو قد قرأ بل حفظ ديوان الشريف الرضي، واتصل منذ اول عهد التادب بالتراث العربي الشعري للرومانتيكيين وكل هذا قد عمل على انماء طبعه الرومانتيكي وتعمق مجراه في نفسه ثم كانت ظروف حياة الرجل وكلها ظروف تضاعف انماء طبعه الرومانتيكي وتزيد مجراه عمقا واتساعاً (۱)

(ناجی کے مزاج، نشوونما اور حالات زندگی نے انہیں اس رومانوی غنائی رجحان کی طرف مائل ہونے میں مدد دی۔ یہاں تک کہ وہ اس میدان میں دوسروں پر سبقت لے گئے۔ ان کا مزاج انتہائی شریف اور بیحد حساس تھا۔ ان میں حزن وحیا کی بہت زیادہ آمیزش تھی اور یہ چیزیں رومانیت پسند لوگوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ جہاں تک ناجی کی نشوونما کا سوال ہے ان میں سلیقہ مندی اور تہذیب وشائستگی پائی جاتی تھی ان کا ماحول روحانی مزاج کا اور کسی حد تک صوفیانہ تھا جس میں

---

(۱) دراسات ادبیة ص ۶۴-۶۵

معاشرتی رسوم و رواج کو اہمیت دی جاتی تھی وہ بڑی حد تک عزلت پسند تھے۔ انھوں نے شریف رضی کے دیوان کو پڑھا بلکہ یاد کرلیا تھا۔ عربی شعری سرمایہ سے جب انھوں نے دلچسپی لی تو آغاز ہی سے رومانیت پسند لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ ان تمام چیزوں نے ان کے رومانی مزاج کو بڑھاوا دیا۔ اور ان کے اندرون میں اسے جاگزیں کردیا۔ پھر ان کے ذاتی حالات بھی ایسے رہے جن سے ان کے رومانوی مزاج کو نشوونما ملی اور اس میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی۔

ابراہیم ناجی نے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں آنکھ کھولی تھی ان کے والد بہت دور اندیش تھے اور بچوں کی فطرت و رجحان سے واقفیت حاصل کرنے کا انھیں زبردست ملکہ تھا۔ اسی مزاج کے مطابق وہ ان کی پرورش کرتے تھے۔ لہذا جب انھوں نے بیٹے کی شاعری کو پہلی بار دیکھا تو اسے ڈانٹنے کے بجائے اس کی ہمت افزائی کی اور قدیم شعراء کے دواوین فراہم کئے۔[1] تاکہ اسکی صلاحیتوں کو مزید نکھارا جا سکے۔ ان دواوین کے مطالعہ سے اس کے اندر شاعرانہ ذوق مکمل طور پر پروان چڑھا۔ پھر اس کے خاندانی پیشے اور اس کے محلے کے ماحول نے اس کی تربیت میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔ جن کے دور رس اثرات شاعر کی زندگی اور شاعری پر مرتب ہوئے۔ بقول عقاد "ابراہیم ناجی کے اشعار میں رقت

---

(۱) غرامیات ناجی: صالح جودت: المجلہ اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۴۹

و دوقت ان کے آباء واجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ ان کے آباء واجداد قالین سازی کا کام کرتے تھے۔ اس پر بہت خوبصورت و نازک بیل بوٹے بناتے تھے۔ اس آبائی پیشہ کو انھوں نے اپنایا تو نہیں لیکن وہ چیز اپنی ساری خصوصیات کے ساتھ ان کے اشعار میں جلوہ گر ہوئی۔ ان کا پورا دیوان ایک نفیس اور اعلیٰ قسم کا قالین ہے جس میں نقش و نگار اور خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ بقول صالح جودت اس پر ان کے ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا کہ انھیں خوش قسمتی سے بہت ہی اچھا ماحول ملا تھا جس میں ان کی فکری بالیدگی کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا جسے ہم بجا طور پر "خوابوں کے شہر" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔(۱)

اسی محلے میں وہ پہلی بار بچپن ہی میں کسی نازنین کی نگاہوں کا شکار ہو گئے(۲) اور اس کے عشق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ زندگی بھر اسی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ اور سراب کی تلاش میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہے۔ لیکن آخر کار ناکام رہے۔ اور اسی ناکامی نے انہیں ایسا شاعر بنا دیا کہ وہ شوقی و عقاد کے ہمسر قرار دیئے جانے لگے۔

بچپن کی اس محبت کے علاوہ انھیں رومانی شاعر بنانے میں چارلس ڈکنس کے رومانی قصہ "ڈیوڈ کوپرفیلڈ" نے بھی کافی اہم کردار ادا کیا۔ جسے انھوں نے پہلی بار والد کی زبانی سنا تھا۔ اسے سن کر وہ اس

---

(۱) غرامیات ناجی ص ۵۰ (۲) نفس مصدر ص ۴۹ مزید دیکھئے کتاب الشعب: جمال الدین الرمادی ص ۲۶

سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے دسیوں بار پڑھا حتی کہ وہ ان کے رگ و ریشے میں سما گیا اور اس قصہ کا جادو ان پر سر چڑھ کر بولنے لگا۔ جس کے اثرات کا اعتراف ناجی نے خود کیا ہے۔ لکھتے ہیں "الذی هو الطبع فی ذهنی هو دافید کوپرفیلد لا اعرف السر فی ذلک، ولکنی اعتقد ان قوة هذه القصة فی انها سیرة صادقة لدیکنز بالذات، عبر فیها اصدق التعبیر عن انفعالاته وشرح فیها الحب العفیف او فی شرح، وکنت انا اذ ذاک فی بدء محاولاتی للشعر، لم یکن عجیبا ان ینتعش دیکنزی خیالی بسموروحه ونقاء قلبه" (۱)

(جو چیز میرے ذہن میں نقش ہوگئی ہے وہ دیوڈ کوپرفیلڈ ہے۔ اس کا راز مجھے نہیں معلوم لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قصہ کی تاثیر کا سبب یہ ہے کہ یہ خود ڈیکنس کی سچی آپ بیتی ہے اس میں اس نے اپنے انفعالات کی سچی ترجمانی کی ہے اور پاکیزہ محبت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ زمانہ میری شعر گوئی کے آغاز کا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ڈیکنس روح کی بلندی اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ میرے دل و دماغ میں سما گیا ہو)

اسی طرح وہ خلیل مطران سے بھی بہت متاثر تھے ان کے اکثر اشعار انھیں ازبر تھے خاص طور پر ان کی وجدانی شاعری کے وہ عاشق تھے وہ بھی اس مغربی سرچشمہ کی طرف متوجہ ہوئے جس سے مطران نے سیرابی حاصل کی تھی۔

---

(۱) عزامیات ناجی ص ۵۰

رومانی شاعری سے اس نے خوب استفادہ کیا وہ ان کے اس اسلوب سے بہت متاثر ہوئے جسکے مطابق شاعر مدنی یا معاشرتی زندگی کی ترجمانی کے بجائے محض محبت اور فطرت کے تئیں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

خلیل مطران کی شاعری نفسیاتی اور معاشرتی دونوں قسم کے احساسات کی جامع ہے وہ اپنی شاعری میں سیاسی واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور کبھی کبھی تاریخ کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور بیشتر اوقات اپنے وجدان کی ترجمانی کرتے ہیں مگر ابراہیم ناجی کی شاعری خلیل مطران سے مکمل طور پر متاثر ہونے کے باوجود خالص نفسیاتی اور رومانیت زدہ تھی۔ (۱)

حالات نے ایک طرف جہاں ناجی کو بہترین معالج و طبیب بنایا وہیں دوسری طرف انہیں خاص قسم کا شاعرانہ ذوق بھی عطا کیا جسکی بدولت ان کا شمار رومانی شاعری کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید احتشام ندوی ناجی کی رومانیت کے بارے میں رقمطراز ہیں "ابراہیم ناجی ابوشادی کی تحریک "اپولو" کا زبردست حامی اور کارکن تھا جس نے جدیدیت کی روح سے سرشار ہوکر نغمہ سرائی کی اور فکر و فن کے موتی بکھیرے۔ اطالوی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے روشنی فکر و نظر حاصل کی اور بہت سے ترجمے بھی ان زبانوں سے عربی میں کئے جس نے ان کی شاعری میں ایک

---

(۱) الادب العربی المعاصر: ص ۱۵۶

نیا رنگ و آہنگ پیدا کر دیا۔ اس کے تین مجموعہ کلام ہیں جو سب رومانی اثرات کے غماز ہیں۔ ایک کا نام ہے "الطائر الجریح" (زخمی چڑیا) دوسرے کا نام ہے "وراء الغمام" (بادل کے پرے) اور تیسرے کا نام ہے "لیالی القاہرۃ" (قاہرہ کی راتیں) اسکی رومانیت پسندی تو ان ناموں ہی سے عیاں ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں دنیا لٹائی ہے۔ جذبات کا طوفان لاکر شوق کا دریا بہایا ہے۔ ایک لہر ہے شوق و تمنا کی جو شاعر کو بہا لے جاتی ہے۔ ایک بے خودی ہے جو غم اور حسن دونوں سے عبارت ہے وہ کہتا ہے۔

امسیت اشکو الاینا مستغرقا فی الفکر و السام

فمضیت لا ادری الی اینا و مسیت تجرنی قدمی (۱)

---

(۱) عربی شاعری کے جدید رجحانات، ص ۷۹

دیوان وراء الغمام

ابراہیم ناجی کا اولین دیوان "وراء الغمام" ہے جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔[1] یہ دیوان کچھ قصائد اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ان میں شاعر نے محبت وجمال کے بارے میں اپنے احساسات بیان کئے ہیں۔ اپنی محبوباؤں کے ساتھ گذرتے ہوئے لمحات کو یاد کیا ہے۔ ان قصائد میں جذبات کی رقت، احساسات کی فراوانی، بھرپور محبت، محبوبہ کی طرف اشتیاق، ہجر و وصال اور شک و رقابت کے مضامین ملتے ہیں۔ یہ قصائد انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کیونکہ ان کا شعور و وجدان اور نفس و روح سے گہرا تعلق ہے۔

اس دیوان میں دو قصیدے ایسے ہیں جو فرانسیسی زبان سے ترجمہ کئے گئے ہیں ایک کا عنوان ہے "التذکار" جو فریدی موسیۃ کا ہے اور دوسرا "البحیرۃ" جو "لامارتین" کا ہے۔ دونوں فرانسیسی رومانوی شاعر ہیں۔[2] ان کی شاعری ناکام و نامراد محبت کی ترجمان ہے۔ ان میں ایسے بے چین و مضطرب انسان کی تصویر کشی کی گئی ہے جو زندگی کے تلخ گھونٹ پی رہا ہے۔

ابراہیم ناجی نے عام شعراء کے برخلاف اپنے لئے نئی راہ اختیار کی۔ اور عام شاعرانہ روش سے ہٹ کر اپنی شاعری میں عوام کے سیاسی اور

---

(۱) الجامع فی تاریخ الادب العربی : حنا الفاخوری ص ۶۶۱

(۲) الادب العربی المعاصر ص ۱۵۶

قومی جذبات کی ترجمانی نہیں کی۔ بلکہ صرف اپنے رومان پرور جذبات واحسا
کی ترجمانی کی۔ مجموعی حیثیت سے اس کی شاعری میں ناکام محبت کی ترجمانی
اس کے حصہ میں صرف تلخ یادیں ہیں ان احساسات کی بہترین ترجمانی
کے قصیدوں "الناي المحترق" اور "العودة" سے ہوتی ہے۔ العودة کا شمار ا
ناجی کے بہترین قصیدوں میں ہوتا ہے۔ اس قصیدے میں زمانہ جاہلیت
قصائد میں پائے جانے والی تشبیب کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے پیش
ہے کہ وہ قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج بن کر رہ گیا ہے۔ اشعار تو
زمانۂ جاہلیت کے تشبیب کی شکل لئے ہوئے ہیں لیکن ان کا پیرہن اگر
فرانسیسی، جدید عربی ادب سے مستعار ہے۔ جسمیں شاعر نے محبوب کے
کی منظر کشی کی ہے۔ کہ محبوب اپنے دیار کی زیارت کرنے جاتا ہے تو وہ ہر
کو اس حال میں پاتا ہے کہ زمانہ کے ضمیر میں وہ ساری چیزیں سرد و گ
کا شکار ہوکر پردۂ خفا میں چلی گئیں۔ مثلاً اس کے حسب ذیل اشعار۔

رفرف القلب بجنبی کالذبیح — وانا اهتف یا قلب اتئد
فیجیب الدمع والماضی الجریح — لم عدنا؟ لیت انا لم نعد
لم عدنا؟ اولم نطو الغرام — وفرغنا من حنین والم
ورضینا بسکون وسلام — وانهینا لفراغ کالعدم
موطن الحسن ثوی فیه السام — وسرت انفاسه فی جوّه
وانا خ اللیل فیه وجثم — وجرت اشباحه فی کهوه

والبلی البصرته رای العیان ویراه تنسجان العنکبوت

صحت یا ویحک تبدو فی مکان کل شئ فیه حتی لایموت

کل شئ من سرور وحزن واللیالی من بهیج وشجی

وانا اسمع اقدام الزمن وخطی الوحدة فوق الدرج (۱)

رنج والم کے ان احساسات کا تذکرہ اس کے دیوان وراء الغمام کے ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ اس میں حال یا مستقبل پر خوشی کا کوئی تذکرہ نہیں، کوئی حسن ظن نہیں بلکہ وہ ہمیشہ بدبختی ومحرومی میں غرق رہتا ہے۔ اس کے بعض قصیدوں میں فطرت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ مثلاً قصیدہ "خواطر الغروب" میں لیکن اس میں بھی وہ اپنے غمگین جذبات کو الگ نہیں کر پاتا اور قدرت کے حسین وجمیل مناظر فطرت کی رعنائیاں بھی اس کے غم کو ہلکا نہیں کر پاتی ہیں بلکہ وہ محبت میں ناکامی کی وجہ سے اتنا دل برداشتہ ہے کہ مناظر فطرت کو بھی اپنے رنج والم کے جذبات کی ترجمانی کے لئے استعمال نہیں کرتا ہے، مثلاً اس کے یہ اشعار

ماتقول الامواج ماالم الشمس فولت صفرینة صفراء

ترکتنا وخلفت لیل شک ابدی والظلمة الخرساء (۲)

اس دیوان میں مختلف مناسبتوں سے تعلق رکھنے والے قصائد نہیں ہیں۔ تمام قصائد میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ سب میں ایک

---

(۱) مختارات من الشعر العربی الحدیث ص ۷۶-۷۷

(۲) الادب العربی المعاصر ص ۱۵۷

ہی مضمون ہے اور وہ ہے محبت۔[1] گویا پورا دیوان ایک قصیدہ کے مثل ہے۔ جو محبت کے لافانی جذبہ کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے اور محبت کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور دل کے نہاں خانہ میں کسی حسین پیکر کی مورتی تراشنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ محبت کی ان خطرناک وادیوں سے بھی آگاہ و متنبہ کرتا جاتا ہے جو ناکام محبت کے نتیجہ میں سامنے آتی ہیں۔ اور ان درد و غم کو آشکارا کرتا ہے جو ایک ناکام محبوب کی قسمت بن جاتا ہے۔

وراء الغمام کے شائع ہوتے ہی ادبی میدان میں زبردست معرکہ برپا ہوا۔ یہ معرکہ ایک طرف تو جماعت الپولو اور عباس محمود العقاد اور ان کے شاگردوں کے درمیان برپا ہوا اور دوسری طرف جماعت الپولو اور طہٰ حسین کے درمیان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگ اس معرکہ کے لئے بہت پہلے سے تیار تھے۔ اس دیوان کی اشاعت نے ایک بہانہ فراہم کر دیا۔

ڈاکٹر عقاد نے دیوان "وراء الغمام" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں ایک بدترین چیز یہ دیکھنے کو ملی کہ شاعر نے دوسرے شعراء سے سرقہ کیا ہے مثلاً اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

یا للقلوب لملتقی اثنین　　لا یعلمان لایما سبب

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۱۵-۱۶ مزید دیکھئے قصائد مجہولۃ ص ۱۱

حموتهما الدنیا غریبین　　فتالفا فی خلوه عجب

عجبا لنا فی لحظة صرنا　　متفاهمین بغیر ما امد

یا من لقیتك اسس صل کنا　　روحین ممتزجین فی الابد

ان اشعار کا مضمون میرے قصیدے "بعد عام" سے سرق ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

مر عام منذ سرنا حیث سرنا　　لا نبالی ما اتی اسرف یاتی

منذ کنا غریبین غصرنا　　کل شئی انا فی الدنیا وانت (۱)

ڈاکٹر عقاد کی اس تنقید پر ڈاکٹر سامی الکیالی نے یوں اظہار خیال کیا ہے: "ہر وہ شخص جو شعری ذوق رکھتا ہے یہ فیصلہ کرے گا کہ ابراہیم ناجی کے مذکورہ اشعار میں جو نفسیاتی حالت بیان ہوئی ہے اس کی تعبیر عقاد کے اشعار کے مقابلے میں ناجی کے اشعار سے زیادہ بلیغ انداز میں ہوئی ہے یا نہیں۔ عقاد کے اشعار میں وہ عمیق فلسفہ مفقود ہے جو ناجی کے اشعار میں بیان ہوا ہے۔" (۲)

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اس کے دیوان پر لغوی اور معنوی اعتبار سے بہت سے اعتراضات کئے کہ "وراء الغمام" کے کیا معنی ہے؟ قصیدہ اور نام میں کیا مناسبت ہے جبکہ ناجی نے ان کو جواب بھی دیا تھا کہ بڑے تعجب کی بات ہے جناب آپ تو ہر ہر لفظ پر گرفت کرتے چلے جا رہے ہیں اور آپ

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۱۷-۱۸ نیز دیکھئے جماعۃ الپولو واثرھا فی الشعر الحدیث، ص ۵۰۰ م ۱۹۹۰ ، (۲) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۱۹

بھول رہے ہیں کہ استعارہ اور مجاز بھی کوئی چیز ہے۔

پھر ملک شام کے ایک نامور شاعر شفیق جبری اس لفظ کی تحلیل اور تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں کہ " میں درحقیقت لغت اور الفاظ کا مفکر نہیں ہوں مگر پھر بھی محسوس کرتا ہوں کہ وراء الغمام کے نام اور قصیدے کے مفہوم میں گہری مناسبت ہے کیونکہ غمام جو بادل کے معنیٰ میں ہے غم و آلام کی تعبیر ہے اور اس کا پورا دیوان اس کی حسرتوں اور پریشانیوں کا ترجمان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ غمام اور غم میں روحانی نسبت بھی ہے کیونکہ بادل جسطرح مختلف مکانات سے اکٹھا ہوجاتا ہے اسی طرح غم بھی دل میں جمع ہوجاتا ہے اور دل کو بوجھل کردیتا ہے۔ پس دونوں میں روحانی نسبت کا پایا جانا صحیح ہوگیا۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابراہیم ناجی اس نام کو رکھنے میں بھی شاعرانہ ذوق کا استعمال کیا ہے۔[1]

اس دیوان میں شاعر نے اپنے ابتدائی عہد کے بہت سے قصائد کو شامل نہیں کیا تھا۔ اسی طرح بہت سے ان قصائد کو بھی شامل نہیں کیا جنھیں وہ معیار سے فروتر سمجھتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خالص شعری نقطۂ نظر سے دیوان وراء الغمام اس کے دیگر دیوانوں سے زیادہ معیاری ہے۔[2] اس دیوان میں شاعر نے اپنے جذبات و احساسات، عواطف

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۲۵-۲۷ اور دیکھئے حدیث الاربعاء ج ۳ ص ۱۷۰

(۲) ناجی حیاتہ وشعرہ، ص ۷۴

وجدان کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کی روح سرشار ہو جاتی ہے اور وہ محبت کی حسین وادیوں میں خود کو فراموش کرنے لگتی ہے لیکن اس کی بے خودی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی کہ ناجی محبت کی ناکامی کی داستان چھیڑ دیتا ہے جس سے اچانک قاری جاگ پڑتا ہے اور زبان حال سے گویا ہوتا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

لیالی القاہرہ

لیالی القاہرہ ابراہیم ناجی کا دوسرا دیوان ہے۔ یہ نام فرانسیسی رومانی شاعر دی موسیۃ کی کتاب "لیالی دی موسیۃ" سے مستعار ہے۔ اس میں بھی راہ محبت میں پیش آنے والے آلام، مایوسی اور حسرت وغیرہ کے احساسات بیان کئے گئے ہیں۔[1] اس دیوان کے سنہ اشاعت کے سلسلے میں ناقدین اور اہل قلم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ عبدالعزیز الدسوقی اس کا سنہ اشاعت ۱۹۴۳ء لکھتے ہیں جبکہ ڈاکٹر محمد مندور اپنی کتاب محاضرات فی الشعر المصری بعد شوقی میں لکھتے ہیں کہ یہ دیوان ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ حسن توفیق کی رائے میں صحیح یہ ہے کہ دیوان ۱۹۵۰ء میں مطبعۃ الفکر سے شائع ہوا۔[2]

اس دیوان پر ابراہیم دسوقی اباظہ نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے شاعر کے جدید مکتبہ فکر کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور اس مکتبہ فکر کا دفاع کرتے ہوئے اس پر تنقید کرنے والوں کا رد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

" یبدو لی ان البواعث التی دفعت الی الھجوم علی اساتذۃ ھذہ المدرسۃ تتجمع فی نطاق الحریۃ التی انطلقت بمواھبھم الی الآفاق الرحیبۃ التی اطلعوا منھا علی الاجواء البعیدۃ عن المعانی والاخیلۃ، مع خلق لبعض الاوزان التی لم یسبق ان

---

(۱) الادب العربی المعاصر ص ۵۸-۵۹

(۲) قصائد مجہولۃ ص ۵۲

نظم غیرہ منہا۔[1]

(معلوم ہوتا ہے کہ اس مکتبہ فکر کے شعراء پر حملہ کرنے کے محرکات میں سے ایک یہ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں آزادی پائی جاتی ہے جس نے ان کی صلاحیتوں کو وسیع آفاق میں پہنچا دیا ہے۔ جہاں سے وہ معانی اور خیالات کے دور دراز فضاؤں میں جھانکتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے بعض ایسے اوزان بھی اختیار کئے جنھیں ان سے پہلے کسی نے نہیں اختیار کیا)

یہ دیوان اس زمانے کی یادگار ہے جب ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیاں اپنے شباب پر تھیں۔ لیالی القاہرہ اس دیوان کا پہلا قصیدہ ہے۔ جس میں قاہرہ کے تاریک پہلو منظر نگاری کی گئی ہے جس توفیق نے اس دیوان کا یوں نقشہ کھینچا ہے"۔ ناجی یتاثر بھا کما لم یتاثر شاعر آخر فی مصر، ویروح ینظم فی وصف تلک اللیالی السوداء، التی دامت خمس سنوات، القصیدة حلو القصیدة، حتی تجتمع له منها ملحمة من سبع قصائد مختلفات الروی، منوعات البحور والقوافی، ولکن تربطها جمیعا وحدة التاثر بالاظلام الذی غمر لیالی القاهره، وحرم عاشق اللیل من المتعة به، فهو فی هذه الملحمة، التی جعلها فیما بعد عنوانا لدیوانه الجدید" لیالی القاهره" لا یعالج موضوع الحرب من ناحیته السیاسیة، وانما یتناوله من ناحیة شخصیة بحتة، حین یتلفت الشاعر حوله فیذکر اللیالی البیض الخوالی، وکیف انمزمت وحل هذا الاظلام

---

(۱) ناجی حیاته وشعره ص ۱۲۳

الذی لم یدع مکانا للسلام فی قلوب العاشقین۔[1]

اس دیوان میں متعدد طویل قصیدے ہیں مثلاً لیالی القاہرہ الخریف، السراب، رسائل محترقۃ اور الاطلال وغیرہ۔ الاطلال نامی قصیدہ میں اتفاقیہ ہوجانے والی محبت کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ عاشق اپنے محبوب سے ملتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ محبوبہ جسم کے آثار قدیمہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اور عاشق روح کے آثار قدیمہ میں۔ اس قصیدہ میں تمام واقعات کی بہترین منظر نگاری کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ شاعر کے بہترین قصائد میں سے ہے۔

یا غراما کان منی فی دمی — قدرا کالموت او فی طعمہ
ما قضینا ساعۃ فی عرسہ — وقضینا العمر فی مأتمہ
ما انتزاعی دمعۃ فی عینہ — واغتصابی بسمۃ فی فمہ
لیت شعری، این منہ مھربی — این یمضی ھارب من دمہ[2]

اور "السراب" نامی قصیدہ میں محبت کے ضائع ہوجانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شاعر کا دل خود ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔ اور وہ دنیا، عوام اور وجود کے احساس سے بالکل بیگانہ ہوگیا ہے۔ اور وہ انسانوں اور وجود کے سلسلے میں اپنی قائم کردہ امیدوں کو مکمل

(۱) ناجی حیاتہ وشعرہ ص ۱۲۵

(۲) احلی ۲۰ قصیدہ حب الشعر الغربی: فاروق شوشہ ص ۱۸۵-۸۶

ہوتا ہوا نہیں پاتا ہے تو اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ وہ خود کو اپنی ذات کے خول میں بند کرلے اور بالکل نفس کی گہرائیوں میں جاکر کہیں گم ہوجائے۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر نے فطرت اور نفس کو یکجا کردیا ہے۔

عندی سماء شتاء غیر ممطرۃ سوداء فی جنبات النفس جرداء[1]

اس دیوان میں اس موضوع کا تسلسل ہے جو پہلے دیوان "وراء الغمام" میں مذکور ہے۔ یعنی شاعر کی محبت، جذبات و احساسات اور رنج والم وغیرہ۔ لہذا ہم اسے "وراء الغمام" کی جلد ثانی کہہ سکتے ہیں۔

البتہ اس کے ساتھ ساتھ اس دیوان میں کچھ قصیدے اور قطعات ایسے بھی ہیں جو مدح، رثا اور دیگر مناسبات سے تعلق رکھتے ہیں شاعر عزت و شہرت کے ایک مقام پر فائز تھا۔ بسا اوقات اس نے بعض حالات سے متاثر ہوکر اشعار کہے ہیں۔ اسی طرح بعض اشعار میں اس نے اپنے ان احباب کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے بعض مواقع پر اس کی مدافعت کی تھی اور اس کی شاعری کو تحسین کی نظر سے دیکھا تھا۔

صالح جودت اس دیوان پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

" کان دیوانہ الاول "وراء الغمام" فی اکثرہ من الشعر الخالص

(۱) احلی ۲۰ قصیدہ حب الشعر الغزلی : فاروق شوشہ ص ۸۵-۸۶

البری من المناسبات، جاء دیوانه الثانی زاخرا بهذا اللون من الشعر الدنیوی الذی لا یوهب للخلود۔ وتراه لا یبدع فی هذا الشعر لانه لیس فی طبیعته، وانما کان یصطنعه اصطناعا وکانما یقدره من الصخور۔[1]

اس دیوان کا ایک پورا باب ابراھیمیات کے عنوان سے ہے جس کے تمام قصائد میں ابراہیم دسوقی اباظہ[2] کا تذکرہ ہے۔ کسی میں ان کی مدح کی گئی ہے تو کسی میں ان کی عزت و تکریم کی باتیں کہی گئی ہیں۔ کسی میں ان سے خوشامدانہ باتیں کہی گئی ہیں۔ کسی قصیدہ میں ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اور کسی میں ان سے اپنی ضرورت پوری کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔[3]

یہ صحیح ہے کہ استاد ابراہیم دسوقی اباظہ نے دیگر شعراء و ادباء کی طرح ابراہیم ناجی سے بھی اپنے تعلق خاطر کا اظہار کیا تھا جب وہ منصب پر فائز تھے۔ اس لئے شاعر نے بھی ان سے احسان مندی کا اظہار کیا۔

اسی بناء پر دیوان کے اس حصہ کے بارے میں

---

(۱) ناجی حیاته وشعره ص ۱۱۸

(۲) ابراہیم دسوقی اباظہ ادیب وشاعر تھے۔ ادباء وشعراء سے محبت کرتے تھے۔ ان کے رفقاء انھیں ابوالشعراء کے لقب سے پکارتے تھے۔

(۳) ناجی حیاته وشعره ص ۱۱۹

ڈاکٹر سامی الکیالی نے لکھا ہے۔ کہ وہ شعر الطبع کے بجائے شعر الصنعۃ کا نمونہ ہیں[1]۔ بالفاظ دیگر ان میں آمد نہیں بلکہ آورد ہے۔

---

(۱) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۳۳، واضح رہے کہ ڈاکٹر کیالی کا تبصرہ ان کی شاعری پر نہیں بلکہ اشعار کی اس صنف پر ہے جس کا استعمال ناجی نے اس دیوان میں کیا ہے۔ یعنی مناسبات، مدحیہ وغیرہ کے شعر۔

الطائر الجریح

ابراہیم ناجی کا تیسرا دیوان "الطائر الجریح" ہے جو ان کے حالات زندگی، ان کی تڑپ، ان کی بے چینی کی بہترین عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور شاید اپنی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تیسرے دیوان کے لئے مذکورہ عنوان اختیار کیا۔ یہ دیوان ناجی کی وفات کے چار سال بعد ۲۴ مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔[1] اسے شاعر کے دوست احمد رامی نے مرتب کیا اور محمد عبد الغنی حسن نے اس دیوان پر طویل مقدمہ لکھا ہے۔ جسکے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔ "یہ اس شاعر کے نغمے ہیں جس نے پوری زندگی رنج والم اور عذاب میں گذاری ہے۔ اپنے ارد گرد چشموں کے باوجود پیاسا رہا اور زاد کی کثرت کے باوجود بھوکا رہا اس نے مسافر کی سی زندگی گذاری اور مہاجر کی طرح جیا۔ اس دیوان میں ناجی نے رقت اور عذوبت کے ساتھ محبت کرنے والوں کے الم وحزن کی ترجمانی کی ہے۔ محبت کی راہ میں پیش آنے والے آلام ومصائب نے اس کو پوری دنیا سے محبت کرنا سکھا دیا۔ چنانچہ اس کا دل بہت کشادہ ہوگیا اور اس نے اپنی مسکراہٹ ہر ایک پر نچھاور کی۔[2]" اس دیوان میں بہت سے قصائد ایسے ہیں جو ناجی نے اپنے دوسرے

---

(۱) قصائد مجہولہ ص ۵۳

(۲) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۳۵-۳۳

دیوان میں شامل نہیں کیا تھا اور کچھ قصائد ایسے ہیں جو انھوں نے دوسرے دیوان کی اشاعت کے بعد لکھا تھا۔

اس میں بھی گذشتہ دواوین کی طرح رنج والم کے جذبات ہیں آہیں ہیں جو الفاظ کے پیکر میں شاعر کی زبان پر آگئی ہیں۔ ان اشعار میں شاعر ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا ہے اور اپنے دفینہ احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ قصیدہ "قصہ حب" میں کہتا ہے۔

یا للمقادیر الجسام دلی — من ظلمها صرحات مجنون
باکی الفؤاد شرّد الامل — وقف الزمان وبابه دونی (۱)

اسی طرح اس کے قصائد "بقایا حلم" "فی ظلال الرحمۃ" "ظلام اور الطا الجریح" وغیرہ میں بھی ہجر، محرومی، تنہائی، شقاوت جیسے احساسات ہیں۔ انھوں نے اپنی مثال ایسے پروانے سے دی ہے جو شمع محبت پر فریفتہ ہے۔ اسکی آگ میں جلتا ہے اور اس پر قربان ہوجاتا ہے۔ لیکن شاعر چونکہ پروانے کی طرح اپنے آپ کو اس پر نچھاور نہیں کرسکتا اس لئے اس کی سوزش شعر کا روپ دھار لیتی ہے وہ کہتا ہے۔

انی امرؤ عشت زما — نی حائرا معذبا
فراشة حائمة — علی الجمال والصّبا
تعرضت فاحترقت — اغنیة علی الرّبی
تناثرت وانتثرت — رماد هاریح الصبا (۲)

---

(۱) الادب العربی المعاصر ص ۱۶۵
(۲) ایضاً ص ۱۶۱

شاعر کے سامنے دوبارہ محبت حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہیں۔ اب اس کے پاس صرف اور صرف یادیں ہیں اور خواب وخیال کی باتیں ہیں وہ کہتے ہیں۔

حلم کما لمع الشہاب تواری　　سدلت علیہ ید الزمان ستارًا

وحبیس شجوٍ نی دی اطلقتہ　　متدافقًا ودعوتہ اشعارًا (۱)

---

(۱) الادب الدبی المعاصر　ص ۱۶۰

قصائد مجہولۃ

ناجی کے کچھ قصائد کا ایک مجموعہ ڈاکٹر حسن توفیق نے "قصائد مجہولۃ" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ پچاس قصائد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۲۳ قصائد ایسے ہیں جو پہلی مرتبہ شائع ہوئے ان میں سے کوئی قصیدہ ناجی کی زندگی میں یا ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے دواوین میں سے کسی میں شائع نہیں ہوا۔ ڈاکٹر حسن توفیق نے اس کے تین ممکنہ اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ یہ قصائد ابراہیم ناجی کی شاعرانہ زندگی کے ابتدائی عہد سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ قصائد ناجی کو اپنا دیوان مرتب کرتے وقت پسند نہ آئے ہوں اس لئے انھوں نے ان میں شامل نہ کیا ہو۔ دوسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ان قصائد کو مابعد مجموعوں کے لئے موخر کردیا ہو مگر ان کی ترتیب کا انہیں موقع نہیں مل سکا۔ تیسرا سبب یہ ممکن ہے کہ وہ ان قصائد کو فراموش کر گئے ہوں۔ ان کے سامنے اپنے قصائد کی بڑی تعداد تھی جن کی موجودگی میں انھوں نے جرائد و مجلات میں منتشر ان قصائد کو تلاش کرنے کی زحمت نہ کی ہو۔[1]

سطور ذیل میں ان قصائد کی فہرست دی جارہی ہے۔ ان کے آگے سنہ اشاعت درج ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے، قصائد مجہولۃ ص ۱۰۱-۱۰۲

(١) مناجاة المهاجر — ١٩٢١

(٢) الذكرى الى حبيب مريض — ١٩٢١

(٣) قبلة التوديع — ١٩٢٢

(٤) الى القمر — ١٩٢٢

(٥) اسعد الله مساءك — ١٩٢٢

(٦) التوبة — ١٩٢٢

(٧) الموسيقى — ١٩٢٣

(٨) بين الشباب والشيب — ١٩٢٦

(٩) السآمة — ١٩٣١

(١٠) ظلام ونور — ١٩٣٣

(١١) وصف اصلع — ١٩٣٣

(١٢) حسناء بجانب امها الدميمة — ١٩٣٣

(١٣) تحية مصر لفلسطين — ١٩٣٣

(١٤) الشباب الثانى — ١٩٣٤

(١٥) رثاء صديق — ١٩٣٤

(١٦) تحية الى دفن الدكتور محجوب ثابت — ١٩٣٤

(١٧) كاس كوكتيل — ١٩٣٤

(١٨) توام الروح — ١٩٣٥

(۱۹) نساء الشوارع — ۱۹۳۵

(۲۰) استرحام — ۱۹۳۶

(۲۱) محمود بك بسيلوني — ۱۹۳۶

(۲۲) مرة — ۱۹۳۷

(۲۳) احياء ذكرى حافظ ابراهيم — ۱۹۳۷

(۲۴) صخرة الكلس — ۱۹۴۰

(۲۵) الدمعة الخرساء — ۱۹۴۱

(۲۶) الورد — ۱۹۴۲

(۲۷) اناء القمر — ۱۹۴۳

(۲۸) غيوم — ۱۹۴۳

(۲۹) انعام (۱) (۲) — ۱۹۴۹

(۳۰) انت سر الابداع — ۱۹۴۹

(۳۱) لا تعجبي — ۱۹۵۰

(۳۲) صولة الحسن — ۱۹۵۳ (۱)

اس مجموعہ میں ۱۸ قصائد ایسے بھی شامل ہیں جو پہلے مختلف جرائد و مجلات میں شائع ہوئے پھر انھیں دواوین میں مرتب کرتے وقت ناجی نے ان میں خاطر خواہ تبدیلی کر دی۔ بعض اشعار میں پورے پورے مصرعے بدل دیئے اور بعض اشعار کی مکمل ہیئت تبدیل کر دی۔ اس تبدیلی

(۱) حسن توفیق ۔ قصائد مجہولۃ ص ۱۰۳-۳

کا اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہو سکتا جن کی نظر سے وہ قصائد اپنی پہلی شکل میں نہ گزرے ہوں۔ تبدیل شدہ شکل میں تو وہ قصائد ناجی کے مذکورہ بالا دواوین میں شامل ہیں۔ البتہ اپنی پہلی شکل میں ان قصائد کو اس مجموعہ "قصائد مجہولۃ" میں شامل کیا گیا ہے۔

(۱) الختام — ۱۹۲۲

(۲) الصورۃ — ۱۹۲۳

(۳) حنین — ۱۹۲۳

(۴) صخرۃ الملتقی — ۱۹۲۷

(۵) اللقاء ۱۹۲۷

(۶) وداع المریض — ۱۹۲۸

(۷) الشک — ۱۹۲۸

(۸) خواطر الغروب — ۱۹۳۰

(۹) عاصفۃ روح — ۱۹۳۵

(۱۰) اعاصیر مصریۃ — ۱۹۳۶

(۱۱) لعبد الشباب — ۱۹۳۸

(۱۲) انوار — ۱۹۳۹

(۱۳) احلام سوداء — ۱۹۳۹

(۱۴) الحیاد الضائع — ۱۹۴۱

(١٥) الكأس ـــ ١٩٤١

(١٦) خائن ـــ ١٩٤١

(١٧) ليالى القاهرة ـــ ١٩٤٢

(١٨) السراب ١٩٤٥ (١)

---

(١) قصائد مجهولة ص ١٠٣-١٠٤

شاعری کے موضوعات

ناجی کی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ ایک قدآور، عظیم اور بلند پایہ شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا محور "عشق و محبت" کے اردگرد بالعموم گھومتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو دوسرے موضوعات یا بالفاظ دیگر دوسرے فنون پر بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ قصائد مجہولۃ کے مرتب رقمطراز ہیں: "لناجی قصائد اخری لایبدو منها فی هیئة الفراشة الحائرة التی تنتقل من غصن الی غصن، عساها ان تجد الزهرة المنشودة هذه القصائد هی التی خرج فیها عن موضعه الاثیر الذی عاش یحترق من اجله ما عاش لیصوره فی فنه طلیلة حیاته۔"(۱)

(ناجی کے دوسرے قصائد بھی ہیں لیکن ان میں وہ پریشان حال تتلی کی مانند نظر نہیں آتے جو مطلوبہ پھول کی تلاش میں ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر جاتی ہو۔ بلکہ تم انھیں ایک نغمہ سرا تتلی کی طرح دیکھو گے۔ یہ قصائد جن میں وہ اپنے اس دل پسند مقصد سے ہٹ گئے ہیں اسکی وجہ وہ سوزش ہے جسے زندگی بھر محسوس کی اور اپنے فن میں اسکی ترجمانی کرتے رہے۔)

لیکن ان میدانوں میں ان کے اشہب قلم نے وہ جواہرات نہیں بکھیرے ہیں جو ہمیں جا بجا رومانی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ شاید

---

(۱) قصائد مجہولۃ ص ۲۸

اس کی ایک وجہ یہ رہی کہ وہ ان موضوعات سخن کی جانب اپنی اس فطرت کے خلاف متوجہ ہوئے ہوں جسکے ریشہ ریشہ میں صرف محبت اور اسکی دلسوزی ہی پیوست تھی۔ (۱)

اگرچہ یہ موضوعات بہت کم زیر بحث آتے ہیں لیکن شاعری کے میدان میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے اور اس کا تجزیہ و مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلو بھی ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوں۔

شاعری کا موضوع — عورت :-

ابراہیم ناجی کی شاعری کا ایک موضوع محبت اور عورت ہے۔ ان کے نزدیک محبت ایک ایسی پناہ گاہ ہے جہاں وہ زندگی کی تکالیف و آلام سے بچنے کے لئے پناہ لیتے ہیں۔ ایسی آرام گاہ ہے جہاں وہ ستم ہائے زمانہ سے دوچار ہونے کے بعد عالم ارضی سے گذر کر پہنچتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

هوى كالسحر صيرني	ارى لقريحة الشهب
وطهرني و نصرني	ومرق معلق الحجب
سموت كانني امضي	الى رب ينا دني
فلا قلبي من الارض	ولا جسدي من الطين

(۱) قصائد مجہولۃ ص ۲۸ اور دیکھئے ناجی حیاتہ وشعرہ ص ۱۱۸-۲۳

سموت ودق احساسی وجزت عوالم البشر
لنسیت ضعائن الناس غفرت اساءة القدر (۱)

ابراہیم ناجی کی شاعری میں رومانی فکر کے وہ نظریات ہیں جنھیں وکٹر ہوگو نے پیش کیا ہے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت ایک مظلوم اور کمزور مخلوق ہے لہذا وہ پستیوں میں جا گرتی ہے ہم اور معاشرہ اس کے پستی میں گرنے کے ذمہ دار ہیں اس فکر سے متاثر ہو کر لکھے جانے والے قصائد میں اس کا مشہور قصیدہ "قلب راقصة" ہے۔ جس میں عورت کے لئے احترام اور تعظیم کے جذبات پائے جاتے ہیں وہ اس کی لغزشوں سے درگذر کرتا ہے اور اسکے گناہوں کے لئے عذر تلاش کرتا ہے خواہ اس کی لغزشیں اور گناہ زندگی کے دشوار گذار حالات کی وجہ سے ہوں۔ مثلا ایک رات تھیٹر میں اس نے ایک رقاصہ کو دیکھا۔ اگلی رات پھر دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ تو وہ یوں گویا ہوئے۔

لا تکتمی فی الصدر اسرارا وتحدثی کیف الاسی شاء
انا لا اری اثما ولا عارا لکن اری امرة و باساء
افدیک باکیة وجازعة قد لفها فی ثوبه الغسق
ودعتها شمسا مودعة ذهبت وعندی الجرح والشفق
تمضی وتجهل کیف اکبرها اذ تختفی فی حالک الظلم

---

(۱) تطور الادب الحدیث: محمد حسین هیکل ص ۳۱۲-۱۳

روحا اذا أتحت يطهرها ناران : نار الصبر والالم (۱)

اس عہد کے شعراء میں سے کچھ لوگ عورت کو روح اور وجدان کا مرکز قرار دیتے تھے۔ اور کچھ لوگ اسے محض جسمانی لذت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مقدم الذکر گروہ میں ابراہیم ناجی اور ہمشری تھے۔ تو موخر الذکر گروہ میں محمود طہٰ اور صالح جودت تھے۔ ابراہیم ناجی اپنی محبوبہ سے یوں سرگوشی کرتا ہے۔

کم مرة یا حبیبی واللیل یغشی البرایا
اهیم وحدی ومافی الظلام شاك سوایا
اصیر الدمع لحنا واجعل الشعر نایا
وهل یلجا حطام اشعلته بجوایا
لیشدو لیشدو اضرینا مرجعا شکوایا
مستعطفا من طوینا علی هواه الطوایا
حتی یلوح خیال عرفته فی صبایا
یدنوا الیّ وتدنو من ثغره شفتایا
اذا بجلمها تلاشی واستیقظت عینایا
ورحت اصغی واصغی لم الف الا صدایا (۲)

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۱۵-۳۱
(۲) مختارات من الشعر العربی الحدیث : مصطفی بدوی ص ۷۹-۸۰

پرانی یادیں :-

ابراہیم ناجی کی شاعری کا ایک اہم موضوع ان مقامات کی جانب جذب وشوق کا اظہار کرنا ہے جن سے ان کی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ اپنے المناک اور قابل نفرین حال سے فرار اختیار کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور ان مقامات کو یاد کرتے ہیں جہاں سے انکی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ اکثر فطری مناظر سے بھرپور ہوتے ہیں اور ان کے دل میں گہری محبت پائی جاتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انھیں خواہشات اور شوق میں ناکامی ہوجاتی ہے۔ اور تلخ حقیقت سے ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جس سے شاعر مزید حسرت ویاس میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مثلاً جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اکٹھا ہوتا تھا اور جس جگہ سے اس کی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں تو اس نے دیکھا کہ یہ ساری چیزیں زمانے کی گردشوں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ اور اپنے احساسات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

هذه الكعبة كنا طائفها والمصلين صباحا ومساء
كم سجدنا وعبدنا الحسن فيها كيف بالله رجعنا غرباء
دار احلامي وحبي لقيتنا في جمود مثلما تلقى الجديد
انكرتنا وهي كانت ان رأتنا يضحك النور النيا من بعيد

رفرف القلب بجنبي كالذبيح وانا اهتف : ياقلب اتئد
فيجيب الدمع والماضي الجريح لم عدنا ؟ ليت انا لم نعد
آه مما صنع الدهر بنا او هذا الطلل الشاحب أنتا ؟
والخيال المطرق الراس أنا ؟ شد ما بتنا على الضنك وبتّا
وطني انت ولكني طريد ايدي النفي في عالم بؤسي
فاذا عدت فللنجوى اعود ثم امضي ليدما افرغ كأسي (۱)

اس قصیدہ کی خصوصیت واہمیت اور تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد مندور رقمطراز ہیں " میری نظر میں یہ قصیدہ جدید عربی شاعری کے بہترین نغموں میں سے ہے۔ یہ اس بات کا صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ تجدید کی دعوت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس کا مفہوم لوگوں کے ذہن ودماغ میں مستحکم ہوگیا ہے۔ کیونکہ یہ قصیدہ عربی کے قدیم اور بے مثال فن " بکاء علی الدیار " کے تحت پروان چڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قصیدے میں کیا جدت ہے؟ اسکی اصل کیا ہے؟ اور اس اسلوب میں کیا حسن اجمال ہے؟ تو جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدت وخوبصورتی اسکی وہ موجیں مارتی ہوئی لہر ہے جو سارے قصیدہ کے اوپر محیط ہے اور اپنی کمزوری کے باوجود اس سیل رواں کی طرح طاقتور ہو جاتی ہے جو جذبات میں ہلچل مچا دیتی ہیں۔ (۲)

---

(۱) مختارات من الشعر العربي الحديث ص ۷۶-۷۷

(۲) مقومات الشعر العربي الحديث والمعاصر : دکتور محمود شوکت ودکتور جابر عبید ص ۲۵۶

فطرت :-

ابراہیم ناجی کو اپنے بعض معاصرین کی طرح فطرت سے محبت بلکہ عشق تھا۔ وہ اپنی ذات کو مناظر فطرت میں جذب کر دیتے تھے۔ فطرت ان کے نزدیک ایسی جائے پناہ تھی جہاں وہ زندگی کی کدورتوں سے محفوظ رہنے کے لئے پناہ لیا کرتا تھا اور اس کے دامن میں سکون محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مناظر فطرت کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کرتا ہے ان کی بڑی ادبی حیثیت ہے۔ اور ان میں ایک جدت طرازی پائی جاتی ہے۔ ابراہیم ناجی اپنے ایک قصیدہ "خواطر الغروب" میں سمندر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

قلت للبحر اذ وقفت مساء — کم اطلت الوقوف والاصغاء

وجعلت النسیم زاد الروحی — وشربت الظلال والاضواء

انت عات ونحن حرب اللیالی — مرقتنا وصیرتنا هباء

وعجیب الیک یممت وجهی — اذ مللت الحیاة والاحیاء

ابتغی عندک التاسی ماتملـــــک ہدأ وما تجیب نداء (۱)

فطرت کی تصویر کشی کے سلسلے میں ان کا قصیدہ "السراب" ایک اعلیٰ شعری نمونہ ہے جسمیں وہ ہمیں فطرت کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں گویا فطرت انکی زندگی کا ایک جزو ہے اور انکی زندگی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۱۷

السراب الخئون والصحراء — والحیادی المشردون الظّماء

ولیال فی اثرھن لیال — سنة اقفرت واخری خلاء

قل زادی بھا وشح الماء — وتولی الزمان والخلعاء

کیف للنازح الحبیب ارتحالی — وجناحای السّقم والبرحاء

وجرای المستنزفات الدوای — وخطای المقیدات البطاء (۱)

انسانیت و روحانیت :—

ابراہیم ناجی تنہائی میں صرف دو چیزوں سے انسیت محسوس کرتے ہیں، ایک فطرت کا چہرہ، دوسرے محبوب کا چہرہ۔ بظاہر فطرت میں وہ تدبر و تفکر کا وسیع میدان پاتا ہے۔ ان کا دل خاموش محبت سے لبریز ہے جس میں وہ اپنی مایوسی کو ڈبو دیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ میں وہ اپنی روح کی تسکین پاتے ہیں۔ ناجی کے اشعار میں عورت عزت وعظمت کے مقام پر فائز ہے۔ وہ اس کی انسانیت اور شرافت کو ہر آن ملحوظ رکھتے ہیں خواہ وہ کسی تھیٹر کی رقاصہ کیوں نہ ہو وہ اسکے نفسیات کی تشریح کرتے ہیں، اسکی مسکراہٹوں کے پیچھے پوشیدہ اسباب کو بیان کرتے ہیں اسی طرح وہ رومانیت پر روحانی عظمت کی ایک تہہ چڑھا دیتے ہیں رقاصہ کو مخاطب کرکے وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔

---

(۱) خلیل مطران شاعر الاقطار العربیۃ۔ ص ۳۲۵ تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۳۲۵-۲۷

هاتی حدیث السقم والوصب　　وصفی حقارة هذه الدنیا
انی رایت اساک عن کثب　　ولمست کربک زائداً حیاً (۱)

منظر نگاری :-

ناجی کے بعض قصائد میں ہمیں خوبصورت منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں انھیں ایک زمانہ میں اپنے دوست انجینیر اور ادیب ڈاکٹر سید کریم سے تعاون ملا جو مجلہ "العمارة" نکالتے تھے۔ وہ ناجی کے پاس خوبصورت سینریاں لاتے تھے اور فرمائش کرتے تھے کہ ان کو دیکھ کر اشعار کہیں اور ان خوبصورت تصویروں کو شعر میں ڈھال دیں۔ اس طرح کے متعدد قصائد مجلہ "العمارة" کے ابتدائی عہد میں شائع ہوئے۔ ایک قصیدہ کا عنوان "راقصة" ہے۔ جس میں ناجی نے ایک رقاصہ کے جسم اور پیرہن کی تصویر کشی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عجبا لعاریة کساها　　الفن حسنا رائعاً
سمراء وشتها بامنته　　بیاضا ناصعا
شبه الفرائد قد کسین　　من الغمام براقعا
خبان نصفا فی الدجی　　وحلون نصفا لامعا
متغائر الابداع تختلف　　المحاسن جامعا

(۱) الجامع فی تاریخ الادب العربی - حنا فاخوری ص ۶۴۳-۶۴۴

لك خفة الطير المحلق　　طائرًا او واقعا

لك خفة البطل المجلي　　مقبلا او راجعا

للخصم متئدا، وحينا　　للقاء مسارعا (۱)

شکوہ :-

ابراہیم ناجی کی شاعری کا ایک اہم موضوع شکوہ وشکایات ہیں۔ وہ بسا اوقات اپنے ایسے رنج والم کا اظہار کرتے ہیں جسکے اسباب واضح ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ان کے اسباب ظاہر نہیں ہوتے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کا غم برائے غم ہے وہ اپنے رنج میں لذت اور غم میں سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنے شکوہ کے ذریعہ لذت الم کا اظہار کرتے ہیں۔ شاید ایسا اسوجہ سے ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رنج والم سے نفس کی تطہیر ہوتی ہے اور غم وروح کو بلندی عطا کرتا ہے۔ یا یہ کہ احساس الم حساس لوگوں کی خصوصیت ہوتی ہے اور غم باشعور لوگوں کا سرمایہ حیات ہے ؎

غم ہے متاع زیست تو اس سے گریز کیوں

جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

ابراہیم ناجی کو تنہائی میں غمگین یادیں اور ناکام آرزوئیں پریشان کرتی ہیں تو ان کے احساسات ان اشعار میں ڈھل جاتے ہیں۔

یا وحدتی جئت کی انسی وھاذا　　ما زلت اسمع اصداء و اصواتا

---

(۱) ناجی حیاتہ وشعرہ۔ ص ۵۳-۵۳

مهما تصاممت عنها فهي هاتفة يا ايها الهارب المسكين هيهاتا

لعشن ما كان مطويا بمرقده ولم يزلن الى ان هب ماماتا

تلفت القلب مطعونا بوحدة واين وحدته باتت كما باتا

حتى اذا لم يجد ريا ولا شبعا افضى الى الامل المطعون فاقتاتا(۱)

قنوطیت :-

ناجی کے اشعار کی نمایاں خصوصیت مایوسی اور اجنبیت کے احساس کا پایا جانا ہے۔ اس سلسلے میں وہ علی محمود طہ اور یورپ کے ان رومانوی شعراء کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں جنھوں نے عزلت نشینی کی زندگی گزاری تھی (۱)

ابراہیم ناجی کا تعلق مدرسہ اپولو سے تھا انھوں نے شاعری میں تقلید کی بیڑیوں سے آزادی حاصل کرلی تھی اور مہجری انداز اپنایا تھا۔ ان کے اوزان خفیف اور ٹکڑے ٹکڑے اور قوافی رقیق اور نرم ہوتے تھے۔ وہ دل کی دھڑکن اور وجدان کی روشنی سے معمور ہوتے تھے(۲)۔ ان کے اشعار وہ رومانوی انداز لئے ہوئے تھے جو مغرب سے ہمارے مہجری اور دیگر شعراء میں منتقل ہوا تھا ان کی شاعری میں ایک بہتر دنیا کی طرف اشتیاق اور زندگی کی تلخیوں پر حسرت و یاس کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ ان مصائب و آلام پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور تقدیر پر راضی برضا رہتے ہیں۔ وہ قنوطیت

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۲۳۲۱ ۲

(۲) الجامع فی تاریخ الادب العربی ص ۶۶۱

پسند ہیں۔ رنج والم، حزن وملال، درد وتکلیف اور مسائل ومصائب ان کا سرمایۂ حیات ہیں۔[1] مثلاً وہ ایک شام اپنی نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہیں اور دنیا کے اسرار ورموز میں غور کرتے ہیں۔ مگر جب انھیں ہر طرف تاریکی ہی نظر آتی ہے تو یہ کہہ اٹھتے ہیں۔

عییت بالدنیا واسرارھا　　وما احتیالی فی صموت الرمال

انشد فی رائع انوارھا　　رشدا فما اغنم الا الضلال[2]

مرثیہ گوئی:- ابراہیم ناجی نے کچھ مشہور شخصیات کے مرثئے بھی کہے ہیں۔ جنکی تعداد دس بتائی جاتی ہے[3]۔ ان میں سے پانچ ان کے پہلے دیوان "وراء الغمام" میں چار "لیالی القاہرہ" میں اور ایک "الطائر الجریح" میں شامل ہے۔ ابراہیم ناجی نے جن شخصیات کے مراثی لکھے ہیں ان کی اکثریت شعراء پر مشتمل ہے۔ ان میں امیر الشعراء احمد شوقی پر چار مرثئے ہیں۔ طاہنوس عبدہ، خلیل مطران، محمد ہمدی، محمد عبد المحطی ھمشری جیسے شعراء پر ایک ایک مرثیہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر عبد الواحد الوکیل کا مرثیہ لکھا ہے جو وزارت صحت کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ جبکہ دسواں مرثیہ انسانی شخصیت پر نہیں ہے بلکہ ایک حیوان ہے جسکا عنوان "رثاء کلب صغیر" ہے۔ ان کے علاوہ قصائد

---

(۱) الجامع فی تاریخ الادب العربی ص ۶۶۲

(۲) نفس مصدر، ص ۶۶۲

(۳) قصائد مجہولۃ ص ۳۲

مجہولۃ کے مرتب کو مزید دو مراثی دستیاب ہوئے ہیں۔ جنمیں سے ایک شاعر نیل حافظ ابراہیم کا مرثیہ ہے۔ جبکہ دوسرا مرثیہ "رثاء صدیق" ہے جس سے مراد ان کے دوست ڈاکٹر محمد نصر الدین ہیں یہ دونوں مرثئے پہلی بار "قصائد مجہولۃ" میں شائع ہوئے۔(۱)

جمال الدین الرمادی ابراہیم ناجی کے ایک اور مرثیہ کا تذکرہ کرتے ہیں اور وہ شہید عبد الحکیم الجراحی کا مرثیہ ہے۔ یہ صرف ان کا مرثیہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ شاعر نے امت عربیہ کی غیرت کو للکارا ہے۔ اس میں بلند و بالا عزائم کا اظہار ہے۔ اور نوجوانوں کی ہمت بندھاتے ہوئے انہیں کارگاہ حیات ورزم میں کود جانے پر ابھارا ہے۔ یہ مرثیہ امت کو دعوت فکر و عمل دیتا ہے کہ اٹھو اور کاخ امراء کے در و دیوار کو تہہ و بالا کر دو تاکہ پھر کوئی اور عبد الحکیم شہید نہ ہو۔

یا شباب النیل فتیان الحمی	وحماۃ الدار اشبال الاجم
زعموکم امۃ هانالۃ	کذب الزاعم فیما قد زعم
نتحداهم علی طول المدی	ثورۃ نکراء شبت تلتهم
حطموا القید الذی حطمکم	واجعلوا استکم فوا لامم
ولقد ادی لمصر دینه	ذلک الغادی ووفی بالقسم (۲)

---

(۱) قصائد مجہولۃ ص ۳۳

(۲) ابراہیم ناجی : الدکتور جمال الدین الرمادی۔ ص ۲۸

ناجی کے مراثی کے اسلوب و خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے قصائد مجہولۃ کے مصنف رقمطراز ہیں: "ان ناجی کان یلجأ فی عدد منها الی طریقة شوقی فی الرثاء، حیث یخاطب الشاعر المیت، مستنهضا ایاه من رقدته لکی یجعله یتامل معه اسرار الحیاة ومعناها او لکی سیاله عما یحدث للانسان بعد موته وبهذا یتعظ الاحیاء ویتذکرون الدار الآخرة والبقاء۔"(۱)

ابراہیم ناجی کا ایک مرثیہ "ساعة تذکار" ہے جو انھوں نے شوقی پر لکھا ہے۔ اس کے چند ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں۔

شجن علی شجن وحرقة نار — من سری فی ساعة التذکار

قم یا امیرا فض علی خواطر — والبث خیالک فی النسیم الساری

واطلع کعهدک فی الحیاة فراشة — عزاء حائمة علی الانوار

یا عاشق الحریة الثکلی افق — واهتف شعرک فی شباب الدار

یا من دعا للحق فی اوطانه — ومضی لیهتف فی دیار الجار

الشام جازعة ومصر کعهدها — نهب الخطوب قلیلة الانصار

الحظ الطمار کما شاء البلی — والعیش رث والسنون عوار(۲)

طنزیہ شاعری:-

اس ضمن میں ناجی کے دو قصیدے "الادباء فی مباذلهم"،

---

(۱) قصائد مجہولۃ، ص ۳۴

(۲) نفس مصدر

"یا دار لاشین" دستیاب ہو سکے ہیں اول الذکر مجلہ "الاسبوع" کے ۳۱ر جنوری ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس میں اس قصیدہ کے کہے جانے کا پس منظر بھی ایک وضاحتی نوٹ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔[۱] جبکہ دوسرے قصیدہ میں صرف چھ اشعار ہیں جو قصائد مجہولۃ میں شامل ہیں۔[۲] اس قصیدہ کو قصائد مجہولۃ کے مرتب نے "الشعر الحلمنتیشی" کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی خصوصیات و اہمیت "الشعر الحلمنتیشی" کے دیگر اشعار سے واضح کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس کا دائرۂ کار صرف انفرادی شخصیات تک محدود رکھا ہے۔ جبکہ اس شعر کے دیگر نمائندہ قصائد کا موضوع سیاست اور پورا معاشرہ ہوتا تھا۔[۳]

ان دونوں قصائد کے علاوہ "تحیۃ الی دفن الدکتور محمود ثابت" "وصف اصلح" اور حسناء بجانب امہا الدمیمۃ" بھی اس طرز نگارش کے نمائندہ ہیں۔ جو پہلی مرتبہ "قصائد مجہولۃ" میں شائع ہوئے تھے۔[۴]

قصیدہ "یا دار لاشین" کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

یا دار لاشین حیتک السلامات

والناس عندک یاکلو الاکل ویباتوا

---

(۱) قصائد مجہولۃ ص ۲۹

(۲) نفس مصدر

(۳) نفس مصدر ص ۳۵

(۴) نفس مصدر ص ۳۲

تموج بالرائح الغادی مواکبها

خلق ضوف واشکال عجیبات

حتی اذا کثروا فی الدار وانقلبت

کمولد البدوی رفی وصیحات

ترن صیحة "تیزتی" فی سلالمها

ما تحتشوا والایة دا اللی اختشوا ثوا

ماذا تری العین؟ انی الیوم فی حلم

وسکی وصنودا واقداح ومزات

کانوا اذا ما اتیح الغرقسوس لهم

یقول قائلهم زارنی النبی ذاته (۱)

وطنی شاعری :-

ناجی نے جس زمانے میں اپنی زندگی کے بہترین ایام گذارے ہیں وہ زمانہ وطن پرستی، خاک وطن کے ذرہ ذرہ سے محبت کرنے اور اس کا ببانگ دہل اعلان کا زمانہ تھا۔ شعراء نے وطن کو موضوع بنا کر بہترین قصائد کہے ہیں جنھیں پڑھ کر وطن سے محبت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اسکی حفاظت کے لئے اپنے جسم کا آخری قطرہ خون بہانے کا جذبہ دلوں میں موجزن ہوجاتا ہے۔

---

(۱) قصائد مجہولة، ص ۲۹-۳۵ بحوالہ مجلة الاسبوع - العدد العاشر - ۳۱ ینایر ۱۹۳۴ء

اور اس راہ میں اپنی جانوں کی قربانی دینے کا حسین جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ابراہیم ناجی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حالانکہ انھیں اپنی ناکام محبت کی لاش کے ٹکڑے سمیٹنے سے زیادہ فرصت نہ مل سکی۔ اور وہ اس جذبہ حب الوطنی کی فضا میں بھی اپنی ناکام محبتوں پر آنسو بہاتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس موضوع پر چند قطعے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ جو اعلیٰ درجے کے تو نہیں ہاں اوسط درجے کے ضرور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اس پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمال الدین رمادی رقمطراز ہیں۔ "کان ناجی الی جانب نزعته الرومانتیکیة فی الشعر شاعرا من شعراء البطولة والفخر، وزخر شعره بصور شتی من صور البطولة، والادب القوی الرفیع الذی یشید بمجد المصریین ویدعوا الی عزة العرب فی العالمین۔ فالقی فی مسامع الشباب دعوات صادقة نحو التحرر والنهوض ورفع مستوی بلادهم الاجتماعی والصناعی، حتی تقف امام الدول الکبری مرفوعة الراس"۔(۱)

اس کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

اجل ان ذا الیوم لمن یفتدی مصرا — فمصر هی المحراب والجنة الکبری

حلفنا تولی وجهنا شطر حبها — وتنفد فیه الصبر والجهد والعمرا

لیث بها روح الحیاة قویة — ونقتل فیها الضنك والذل والفقراء

نحطم اغلالا ونمحو حوائلا — ونخلق فیها الفکر والعمل الحرا (۲)

---

(۱) جمال الدین الرمادی، کتاب الشعب، ص ۲۷-۲۸

(۲) نفس مصدر

اس ضمن میں ہمیں ان کے چھ قصیدے ملتے ہیں۔ تین وراء الغمام میں شامل ہیں اور دو لیالی القاہرۃ میں جبکہ چھٹا قصیدہ مجلہ العمارہ میں ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سارے قصائد انھوں نے مختلف وطنی مناسبات کے پیش نظر کہے تھے۔ ان قصائد کے عناوین "الاضحۃ المحترقۃ (وراء الغمام) "مصر" اور "لبطل الابطال" (لیالی القاہرۃ) ہیں۔(۱)

ان قصائد پر تبصرہ کرتے ہوئے قصائد مجہولۃ کے مرتب رقمطراز ہیں۔ "نحن لو تاملنا قصائدہ التی نشرھا فی دیوانہ الاول، فاننا سنلاحظ علیھا غلبۃ الخطابۃ وعلوۃ النبرۃ واولی ھذہ القصائد تکاد تصبح برمتھا نموذجا للشعر الزاعق الذی یتسم بالطابع المدرسی، وھو مما تحفل بہ کتب النصوص فی المدارس الاعدادیۃ والثانویۃ عندنا۔(۲)

سیاسی موضوعات :-

ابتداءً ابراہیم ناجی اپنی شاعری میں سیاسی موضوعات سے اجتناب کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان میں بھی وہ اشعار کہنے لگے۔ چنانچہ ان کے متعدد قصائد معاصر سیاسی موضوعات سے متعلق ہیں مثلاً "مصر" "یوم الشباب" "الشہید الجراحی" جو ۱۹۳۵ء میں انگریزوں کی گولی سے جاں بحق ہو گیا تھا، اس کے متعلق ہیں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے قصائد مجہولۃ ص ۳۶-۳۹

(۲) قصائد مجہولۃ ص ۳۶

بعض قصائد میں انطون الجمیل، دسوقی اباظہ، عزیز اباظہ، عبد الحمید عبد الحق ابراہیم عبد الھادی، ڈاکٹر علی ابراہیم، ڈاکٹرز کی مبارک اور سامی الشوا کی سیاسی مدح کی گئی ہے۔ اس طرح بعض قصائد ان مناسبات سے متعلق ہوتے تھے جو "جماعۃ ادباء العروبۃ" کے جانب سے متعین کئے جاتے تھے۔ (۱)

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۲۸

الوجدان الفردی (انفرادی وجدان)

تحریک ابولو نے عربی شاعری میں ایک نئے رنگ و آہنگ کی بنیاد رکھی۔ جو قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس تحریک کے شعراء نے جہاں نئے موضوعات میں اپنی جولانی طبع دکھائی ہیں وہیں دوسری زبانوں کے ادب عالیہ اور ان کے شہ پاروں کو بھی عربی زبان میں منتقل کرکے اس کے دامن کو مزید کیا۔ اور اس کے گیسو کو مزید آبدار بنایا۔[1] یہ تحریک جدید عربی شاعری میں ایک وجدانی رخ کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو ذاتی تجربات کی تصویر کشی، دل کی دھڑکنوں، نفس کے میلانات، وفور جذبات، فطرت اور صنف نازک سے وابستگی کو مختلف پیرایہ میں بیان کرنے میں ایک خاص امتیاز کی حامل ہے۔

شعراء ابولو نے اپنی شاعری کا موضوع فطرت کے ہر رنگ کو قرار دیا اور ان موضوعات کو حرز جاں بنا کر ان کی بہترین تصویر کشی کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کے ہر رنگ کو گویا زبان مل گئی ہو۔ لیکن ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ان کا انفرادی وجدان ہے۔[2] اس تحریک کے بعض شعراء اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے بدولت اوج ثریا پر نظر آتے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے نت نئے تجربات کئے اور زبان و ادب کے سرمایہ میں ایک

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے، جماعۃ ابولو ص ۳۵۱-۵۲

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے، جماعۃ ابولو ص ۳۷۸-۳۸۱-۳۹۹-۴۰۳

گرانقدر اضافہ کیا۔ جن شعراء نے تحریک اپولو کے جلو میں چلتے ہوئے اپنے خون جگر سے جدید عربی شاعری کی آبیاری کی۔ ان میں سے ایک اہم نام ابراہیم ناجی کا ہے۔

ناجی کی شخصیت شاعری کی دنیا میں ایک نئی شخصیت تھی اس لئے کہ انھوں نے شعر کو اس طرح سمجھا تھا جس طرح دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکے تھے۔ ان کے معاصرین اور دوسرے لوگوں نے قدماء کی طرح یہ سمجھا تھا کہ شاعری ایسے کلام کو کہتے ہیں جسے بالارادہ موزوں اور مقفی بنایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ناجی نے کہا کہ شاعری دراصل ایسی موسیقی ہے جس سے جذبات طرب میں آجاتے ہیں۔ دلوں کو سکون ملتا ہے۔ روح اور ضمیر وجد میں آجاتے ہیں۔ الہامی شاعر وہ انسان ہے جسے انسانیت اس لئے منتخب کرتی ہے تاکہ وہ اس دنیا میں محبت وامن، نیکی وبھلائی، حسن وجمال، عفو ودرگذر اور رواداری کا پیغامبر بنے۔ اس کے ساتھ رہ کر انسانیت کو ویسا ہی سکون واطمنان ملے جیسا اہل جنت کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور خوشنودی پا کر حاصل ہوگا۔ ابراہیم ناجی کے لئے یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ وہ ان باتوں کو سوائے اپنے خیال کے کہیں اور نہیں پاتے تھے۔ ان کے اشعار کو پڑھنے والا محسوس کرسکتا ہے کہ یہی بات انھیں پریشان کرتی ہے، اسی کے لئے وہ آہ وبکا کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات طوفان کی طرح بپھرتے ہیں۔ وہ بیڑیوں کو توڑ دیتے ہیں اور فضا کو شعلوں سے بھر دیتے ہیں۔(۱) ڈاکٹر مختار وکیل اپنی

---

(۱) تاریخ الادب العربی فی العصر الحاضر ص ۳۵۰

مشہور کتاب "تحیہ ذکری" میں رقمطراز ہیں کہ "نقاد اور ادباء نے ہمیشہ شعر کی تعریف میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ شعر نام ہے موسیقی اور بہترین دلفریب نغمات کا اور اس معنی میں ابراہیم ناجی ایک ممتاز شاعر تھے۔ کیونکہ ان کی شاعری موسیقیت کی جامع ہے اور وہ اپنی شاعری سے جمال کے اسرار و رموز پر قابض تھے۔"(۱)

غنائی اور وجدانی شاعری ناجی کی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے جس میں انہوں نے فطرت سے مدد لی ہے۔ اور اپنے احساسات کی ترجمانی کی ہے جدید عربی شاعری پر جو رنگ نمایاں ہے وہ دراصل انفرادی وجدان ہے۔ جماعت ابولو کے اکثر شعراء نے اپنے ذاتی و انفرادی وجدان کو رقم کیا ہے۔ اس کی زمام قیادت ناجی کے ہاتھ میں تھی اور ناجی ہی اس کے علمبردار رہے۔ اس قسم کی شاعری میں ناجی نے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چند قصائد کو چھوڑ کر ان کی پوری شاعری ان غم و آلام کی منہ بولتی تصویر ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں قدم قدم پر دوچار ہوتے رہے۔ یہ چیز اس پر کچھ اس طرح غالب آئی کہ احمد الصادی نے اس کی پوری شاعری کو "قصیدۂ حب" قرار دیا ہے۔(۲)

ان کے قصائد ایک ہی موضوع کے ارد گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ بہت سے شعراء ایک ہی قصیدہ میں مختلف موضوعات سے بحث کرتے

---

(۱) تحیۃ ذکری ص ۵۹۹

(۲) جماعۃ ابولو ص ۴۲۵

ہیں جو ایک بڑا نقص ہے۔ ناجی اس سے محفوظ تھے۔ ناجی کے موضوعات زندگی، فلسفہ، محبت اور جمال ہوا کرتے تھے۔ انکی وجدانی شاعری اپنے فطری رنگ میں نظر آتی ہے جسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہیں عربی زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ دیگر ادبیات میں بھی تعمق و درک حاصل تھا۔ انھوں نے انگریزی و فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ کیا۔ اس میں مہارت حاصل کی۔ پھر ان کے افکار و معانی کو اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیں مختلف ترقی یافتہ ادبیات کے محاسن کی جامع نظر آتی ہے جسمیں ہمیں مختلف رنگ و بو کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔ ناجی نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ وہ اس زبان میں شعر کہنے پر قادر ہوگئے تھے انھوں نے بعض قصائد انگریزی زبان میں بھی لکھے ہیں۔ جو مجلہ اپولو میں شائع ہوئے۔ ناجی نے علم النفس کے موضوع پر بھی کافی کچھ لکھا ہے۔[1] ان کے اشعار نفس کے خلجانات اور ہیجانات کے ترجمان ہیں۔

ابراہیم ناجی کی شاعری ان کے احساسات و رنج و غم اور پراگندہ تمناؤں کی عبارت ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی شاعری ہے جو محبت کا پیاسا تھا جسے محبت سے بہرہ ور ہونے کا کبھی موقع نہیں مل سکا۔ اس میں اسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی طرح اپنے دوستوں اور سماجی تعلقات کے سلسلے میں بھی وہ محبت میں ناکامی سے دوچار رہے۔ یہ ناکامیاں ان کے دل

---

(۱) اعلام النثر والشعر ص ۱۰۵

کو ایک تڑپ سوز دروں اور کیفیت درد عطا کرتی ہیں۔ اس درد کے سہارے وہ خود جیتے ہیں اور دوسروں کو جینے کی آرزو دلاتے ہیں۔ اور پورے جہاں میں اپنا یہ درد لیکر گھومتے ہیں۔ ناجی اپنی اس پریشانی میں اس چڑیا سے کافی مشابہت رکھتے ہیں جو مختلف مکانات میں گھومتی رہتی ہے۔ اور کسی مستقل جگہ سکونت پذیر نہیں ہوتی۔[1] غالباً ان کی یہی فطرت محبت میں ناکامی کا سبب بنی۔ شفیق جبری ان کی اس خصوصیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"ابراہیم ناجی کی شاعری میں جو کرب پایا جاتا ہے وہ اگرچہ بہت سے شاعروں کے کلام میں موجود ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ناجی کے کرب پر فرحت و مسرت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جبکہ دوسروں کا کرب عیاں ہے جب ان پر کچھ شاق گزرتا ہے تو وہ اس پر سفید پردہ نہیں ڈال دیتے بلکہ اس پر ایسی تیز روشنی ڈالتے ہیں جو لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کردیتی ہے وہ اس کی سیاہ پہلو سے بھی مانوس ہیں اس کی ظلمت کو بیان کرتے ہیں خواہ لوگوں کو اچھا لگے یا برا۔ اس کے برخلاف ابراہیم ناجی اپنے کرب میں دوسروں کو شریک نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ اس پر تیز روشنی کا پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ کوئی ان سے وحشت زدہ نہ ہو۔"

اگرچہ ابراہیم ناجی اپنے ظاہر پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مگر اپنے باطن کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ ان کی شاعری

---

(۱) جماعۃ الپولو ص ۴۲۵

آنکھوں کے آنسوؤں اور خون جگر سے سیراب ہے اور ان میں جذب و شوق کی فراوانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس میں ایک ایسا روشن پہلو نظر آتا ہے جس میں شاعر نے خوشنما خیالات اور سنہری تمناؤں کو بیان کیا ہے۔ اس طرح شاعر میں دو متضاد روحیں نظر آتی ہیں۔ ایک روح جو خوش و خرم اور ہشاش بشاش ہے وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتی ہے اور دوسری صرف اس کے اندرون میں ہے جسکا اس پر مسرت زندگی سے کوئی تعلق نہیں"[1] اسی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہوئے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

یا من احب وافتدی ویلذ لی فیہ الالم

لک حسن نور الجمیلۃ ظل صبحا فابتسم

لک نضرۃ الفجر الجمیـ ل علی الذوائب والقمم (۲)

اسی طرح ہم ان کے قصیدہ "رسائل محترقۃ" میں ان کے پیار کی داستان کے عذاب کو محسوس کر سکتے ہیں جسکی دیواریں منہدم ہوگئی تھیں اور کھنڈرات کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا بلکہ باقیماندہ کو بھی آگ نے اپنا ایندھن بنا لیا اور وہاں راکھ اور کوئلہ کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس صورت حال کو ان وجدانی احساسات کے ساتھ بیان کیا جسمیں غم و حزن گویا ابلا پڑ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ذوت الصبابۃ والنوت وفرغت من آلامھا

---

(۱) مجلہ الحدیث عدد/۷ جولائی ۱۹۳۷ء ص ۴۱۳

(۲) خلیل مطران شاعر الاقطار العربیۃ، جمال الدین الرمادی ص ۳۳۱

لکننی القی المنایا　　من بقایا جامها

لی لیلة نکراء ارقب　　فی طویل ظلامها

نامت رسائل حیرها　　کالطفل فی احلامها

زرقاء حیرها البلی　　کسحابه بغمامها

اشتلت فیها النار ترعی　　فی عزیز حطامها

تغتال قصة حبنا　　من بدئها لختامها

احترقتها ورمیت قلبی　　فی صمیم ضرامها (۱)

اس قصیدہ میں شعر کی نغمگی، جذبات و وجدانی احساسات کے ساتھ ساتھ جدید لغوی تراکیب، فنی مذاق اور نفسانی جذبات کی دلالت کو ایک غمناک شعری قصہ کی شکل میں پاتے ہیں۔

ناجی نے ہمیشہ محبت کی ترجمانی کی ہے اور اگر کبھی محبت کے علاوہ کسی دوسرے حسی یا معنوی موضوع پر اظہار خیال کیا ہے تو اس میں بھی کسی نہ کسی اعتبار سے محبت کا موضوع آگیا۔ مثلاً جب وہ سمندر کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس اعتبار سے کہ وہ عاشق و معشوق کے وصال کی جگہ یا کسی محروم عاشق کے لئے ویرانہ ہے۔ جب وہ ستارے کا تذکرہ کرتے ہیں تو یوں گویا وہ کسی رونے والی حسینہ کے رخسار پر لڑھکنے والا آنسو ہے۔(۲) انھوں نے زندگی کی تمام دھڑکنوں کو محبت کے نام کردیا تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

---

(۱) مقومات الشعر العربی الحدیث والمعاصر ص ۲۵۴

(۲) ناجی حیاتہ وشعرہ ص ۱۴۱

حبیب کان دنیا املی حبه المحراب والکعبة بیته (۱)

ناجی نے عشق و محبت کے خوش آئند پہلوؤں پر ہی سا
زور صرف نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کے اس پہلو پر بہت ہی کم اشعار ملتے ہیں
انھوں نے ہمیشہ رنج و الم، قلق و ارتیاب کی شاعری کی ہے۔ ان کے اکثر قصائد
ایام شباب کے حزنیہ یادوں کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کے محبت کی شورش
وتپش، روحانی قلق وکرب اور جذباتی پیاس کی بہترین تعبیر قصیدہ "الحیوا
سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ان عدت او اخلفت لم تعد انا الف سواحلک آخر الابد
ظمأ علی ظمأ علی ظمأ وموارد کثیر ولم ارد
مر الظلام وانت لی شجن واتی النهار وانت فی خلدی
لا یسمع البحر الغضوب الی شاک ولا یصغی الی احد
کم لاح لی حرب الحیاة علی امواجه المجنونة الزبد
من یومه یوم بلا امل وغد بلا سلوی ولعد غد
لولاک والعهد الذی عقدت بینی وبینک بهجتی ویدی
اضجعت جنبی جوف غیهبه وارحت فیه بانی الجسد
یا ظالمی! عیناک کم وعدت قلبی اذا اشفقتاک لم تعد (۲)

احمد زکی ابوشادی انھیں ناکام محبت کے باعث

---

(۱) شعراء الحرب المعاصرون، رضوان ابراہیم ص ۴۱۸
(۲) جماعة الیولو، ص ۴۲۹-۳۰

شاعر اللھفۃ"[1] کا لقب دیتے ہیں۔

ان کی شاعری کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے احساسات کی بعینہ ترجمانی کی ہے۔ مبالغہ آمیزی سے کوسوں دور ہے۔ ان کے کلام میں جذباتی رقت انسانی احساسات اور موجزن محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عقاد نے انھیں "شاعر الرقۃ العاطفیۃ"[2] قرار دیا ہے اور پروفیسر صالح جودت کہتے ہیں کہ "کان المرحوم الدکتور ابراہیم ناجی اکبر شعراء العاطفۃ فی عصرہ"[3]۔ اور ڈاکٹر محمد مندور کہتے ہیں "ناجی قصیدہ غرام"[4]

جذبات و احساسات کی حرارت وحدت ناجی کے اشعار کی سب سے اہم خاصیت ہے جو کبھی کبھی ان کے بعض قصائد کی سادگی کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ اس کو ہم ان کے اکثر قصائد پر منطبق نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اپنے اشعار میں الفاظ کا سہارا لیکر مجسم صورتیں اور تصویریں بناتے ہیں اور الفاظ کے جادو سے کام لیتے ہیں۔ ناجی اپنے اس خاص شعری اسلوب کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں

ان خانني اليوم فيك غد ... وابن مني ومن لقاك غد

ان غدا هوة لناظرها ... تكاد منها الظنون ترتعد

---

(۱) جماعۃ الپولو ص ۴۲۵

(۲) غرامات ناجی ص ۴۹

(۳) نفس مصدر

(۴) جماعۃ الپولو ص ۴۲۵

اظل فی عمقها اسائلها افیك اخفی خیاله الابد [1]

ڈاکٹر ابو الخشب ناجی کی شاعری پر مختصر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ "انه کان جدیدا فی تفکیره واخیلته وصیاغته وتصویره" [2] (ناجی اپنے فکر و فن، خیالات، اسلوب اور تصویر کشی میں تجدیدی شاعر تھا)

شاعر کی پوری زندگی حسرت، امید پھر مایوسی اور آنسوؤں میں گزر گئی۔ شعر کی نغمگی، جذباتیت و وجدانی احساسات غالبا اس کی ناکام محبت کی بے چینی، پریشانی اور حسرت کی شکل میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مختار وکیل نے بہت بہترین انداز میں ناجی کے اس پہلو پر تبصرہ پیش کیا ہے۔ "ناجی کے بارے میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ جدید عربی شاعری کے غنائی شعراء میں وہ صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کے الفاظ بڑے سلیس معانی، بہت دقیق اور موسیقی آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین کا انحصار محبت غزل اور عاطفی زندگی پر ہوتا ہے۔ اس قسم کے شاعر کی موت نہیں ہوتی۔ رہتی دنیا تک اس کے فن اور کارنامے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار، پر جوش عواطف اور قیمتی تجربات ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے اور ہر زمان و مکان میں بشر کے نفوس میں ہلچل مچائیں گے۔" [3]

---

(۱) مقومات الشعر العربی الحدیث والمعاصر ص ۴۵۵

(۲) تاریخ الادب العربی فی العصر الحاضر ص ۲۴۸

(۳) تحیة ذکری ص ۵۹۹

محبت کی ہی ناکامی نے ناجی کو شاعری کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ اگر وہ محبت میں کامیاب ہوجاتے تو شاید ان کے کلام میں جذبات و وجدان کا وہ عنصر نہ ہوتا جو اس وقت ان کے ہر مصرعہ سے نمایاں ہے۔

یوں تو ابراہیم ناجی اپنے خیالات کو رومانی تعبیرات کی صورت میں پیش کرتے رہے۔ لیکن ان کی شاعری میں ہمیں بعض جگہ رمزیت کے پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ رمادی رقمطراز ہیں۔ "ظهرت الرمزية في بعض اشعار ابراهيم ناجي واغرم بالرموز التي استهوت غيره من الشعراء الاوربين امثال بودلير وبول فاليري رامبو وفرلين وغيرهم"(۱)

ناجی کی وجدانی کیفیت بڑی مختلف ہے۔ کبھی وہ اطلال پر روتے ہیں اور کبھی ضائع شدہ محبت کی امید بھی کرتے ہیں تو کبھی اس کی ذکریات سے منسلک جگہوں پر کھڑے ہوکر یاد کو تازہ کرلیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کیفیت کی بہترین تعبیر کے لئے کبھی کبھی رمزیت کا سہارا لیکر اپنے جذبات و احساسات کو رقم کرتے رہے جس کا بہترین نمونہ اس کا قصیدہ "العودة"(۲) ہے۔ جو ابراہیم ناجی کی سب سے حسین و خوبصورت کاوش ہے۔ اس کے علاوہ چند اور نمونے بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

تعال سل القبيلة والجمالا — لاية غاية شدو الرحالا
وكيف تبدلوا رضا بارض — وكيف تغيروا حالا وحالا

---

(۱) کتاب الشعب ص ۲۸
(۲) جماعة اپولو ص ۴۲۶

پھر وہ کہتے ہیں۔

أقافلة الحياة ارتئيها فلم تر مثلها عيني مثالا

اجل هي نحن في الدنيا جيارى وما ندرى لقافلة مآلا

رأيت حياتنا كم من غريب على جنبيه بالاعياء مالا

وكم من سائل لم يلق ردا وقد سأل الهواجر والرمالا

فان تجب القفار عليه يوما ترد له صوافيها السؤالا

أقافلة الحياة ارتئيها خيالا او ضلالا او محالا (١)

---

(١) كتاب الشعب، الدكتور جمال الدين الرمادى، ص ٢٨

فلسفیانہ شاعری :-

ابراہیم ناجی کی شاعری میں بعض اوقات خالص فکری موضوعات بھی ملتے ہیں۔ کبھی وہ ایک صوفی کی حیثیت سے غور و فکر کرتے ہیں تو کبھی ایک فلسفی کی حیثیت سے ان پر نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں ان پر جذباتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ایک قصیدہ میں جس کا عنوان ہے "الحیاۃ" وہ بیان کرتے ہیں کہ جب انسان زندگی کے حقائق پر غور کرتا ہے تو بسا اوقات سامنے کوئی بات واضح ہو کر نہیں آپاتی ہے اور اس کا علم و جہل دونوں برابر ہو جاتے ہیں اس لئے کہ وہ چھوٹا اور فریب خوردہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

جلست یوما حین حل المساء — وقد مضی یومی بلا مؤنس

اریح اقداما وهت من عیاء — وارقب العالم من مجلسی

ارقبه یاکد هذا الرقیب — فی طیب الکون وفی باطله

وما یبالی ذالخصم او اعلم — من غامض اللیل ولغز النهار

سیستمر المرح الاعظم — روایة طالت واین الستار[1]

سامی الکیالی مذکورہ بالا قصیدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ "افق ناجی فی فلسفة الحیاة وتصویر مباهجها ومآسیها شئ جدید فی شعرنا المعاصر"[2]

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۲۵

(۲) مقدمہ دیوان ابراہیم ناجی ص ۸۱۷

(ہماری جدید عربی شاعری میں فلسفہ حیات اور اس کی مسرت اور پریشانی کی عکاسی میں ناجی کا شاعرانہ افق بالکل نیا تھا)

ڈاکٹر طہٰ حسین نے بھی اس پہلو سے ان کی تحسین کی ہے ان کا کہنا ہے کہ "ہم ناجی کو ایسا فلسفی شاعر قرار دے سکتے ہیں جس نے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو اپنے فکر کا موضوع بنایا ہو اور واقعہ یہ ہے کہ فلسفی وہی ہو سکتا ہے جو لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے بحث کرے۔"(۱)

ناجی کے فکر اور فن میں کسی قسم کا تکلف نظر نہیں آتا ہے بلکہ وہ دل کی گہرائی سے زندگی اور زندگی کے حقائق کے متعلق شاعری کرتے ہیں اس قسم سے متاثر ہو کر لکھے جانے والے قصائد میں اس کا بہترین قصیدہ "قلب راقصة" ہے اس قصیدہ پر سامی الکیالی تبصرہ پیش کرتے ہیں کہ "یہ قصیدہ ناجی کے فلسفیانہ قصیدے میں سے ایک بہترین قصیدہ ہے۔ جو انسانی ضمیر کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ شاعر نے رقاصہ کی مجبوری اور پریشانی کا اتنا عمدہ نقشہ کھینچا ہے جو براہ راست انسانی دل اور احساسات پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

احمد رامی ناجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ "ابراہیم ناجی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے جدید مکتب فکر

---

(۱) دیوان ابراہیم ناجی صہ ۸۲

میں ادب کی ایک مضبوط بنیاد رکھی ہے۔ اس کے اشعار میں ایک ہی مقصد نمایاں ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ ادب کا لطف اس طرح لیں کہ ادب روح اور جذبات کی غذا ہے۔ اور اگر زندگی افسانوی ادب، حقیقی ادب اور فلسفیانہ ادب سے خالی ہو تو وہ کھوکھلی اور بے کار ہے۔ ناجی اپنی شاعری میں ایک ایسے فنکار کے مانند ہیں جو یہ تصویر کشی کرتا ہے کہ کس طرح احساسات بھڑکتے ہیں۔ کس طرح پر سکون ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ کس طرح وہ نفس کے اندر موجزن ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسے خیر کی طرف موڑتے ہیں اور اعلیٰ اقدار کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مقاصد کی پاکیزگی، ان کی عظمت اور پست چیزوں سے اعراض پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ادیب اور اپنے نظم میں معلم تھے۔ ان کی فکر میں گہرائی پائی جاتی ہے۔(۱)

---

(۱) صدیقی ابراہیم ناجی، احمد رای، مجلہ الھلال، مئی ۱۹۵۳ء

اسلوب

ابراہیم ناجی جس تحریک سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلوب اور طرز ادا کے معاملہ میں بہت سی خصوصیات رکھتی تھی۔ اس کی بنیاد طلاقت لسانی اور تعبیر کی آزادی پر تھی۔ اس میں الفاظ کی دلالتوں اور صفات کا استعمال نئے انداز پر ہوتا تھا۔ مجاز کے استعمال میں بہت زیادہ توسع سے کام لیا جاتا تھا ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے جو مخصوص موسیقی لئے ہوئے ہوں۔ اور ایسی تعبیرات اپنائی جاتی تھیں جن کا مخصوص پس منظر ہوتا تھا۔ ابراہیم ناجی اس تحریک کے نمایاں اور سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ لہذا مذکورہ خصوصیات ان کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ ذیل میں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ناجی کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کو ان کے قریبی مانوس استعمال سے ہٹا کر انھیں دوسرے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم مجاز کے طریقے پر نہیں جسکا تذکرہ ماہرین بلاغت نے کیا ہے بلکہ جدید مجاز کے ذریعہ جسمیں مثلاً کسی سنی جانے والی چیز کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو محسوس کی جانے والی یا دیکھی جانے والی یا سونگھی جانے والی چیز کے لئے استعمال کئے جاتے ہوں یا اس کے برعکس صورتیں چنانچہ انکی شاعری میں اس قسم کی تعبیریں ملتی ہیں۔ نعومۃ النغم

(نغمہ کی ملائمیت) بیاض اللحن (لحن کی سفیدی) تعطر الاغنیۃ (گانوں کی عطر بیزی) العطر القمری (چاندنی رات کی خوشبو) الاریج الناعم (نرم خوشبو) العبیر المنغوم (نغمہ آمیز خوشبو) وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رمزی شعراء سے شدید متاثر تھے جو اس اسلوب کے علمبردار تھے۔ بوڈلیر فرانس کا رمزی شاعر تھا۔ ابراہیم ناجی اس سے بھی بیحد متاثر تھے۔ انھوں نے اسکی شاعری کو "ازھار الشر" کے نام سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اس نے ادب سے استفادہ کرکے اس کے اسلوب کو عربی میں منتقل کیا۔

ان کے اسلوب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ معنویات کو محسوسات میں ڈھال کر بیان کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زندگی پائی جاتی ہے اور وہ کوئی چلنے پھرنے والی مخلوق ہے۔ مثلاً وہ قدیم محبت کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

ذوت الصبابۃ وانطوت　　وفرغت من آلامھا

عادت الی الذکریات　　بحشدھا ورخامھا (۱)

صبابۃ (عشق) ایک تجریدی شئی ہے اس کے لئے شاعر نے مرجھانے (ذوت) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اس کے لئے لپٹنے (انطوت) کی تعبیر استعمال کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں انھوں نے یادوں (ذکریات) کے لئے بھیڑ بھاڑ (حشد، ازدحام) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

---

(۱) تطور الادب الحدیث فی مصر ص ۳۳۳ (قصیدہ رسائل محترقہ)

ان سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی محسوس اور مجسم اشیاء ہیں۔

اسی طرح وہ آنے والے کل کے بارے میں کہتے ہیں۔

ان غدا هوة لنا ظرها　　تكاد فيها الظنون ترلقه

اظل في عمقها اسائلها　　افيك اخفى خياله الابد (۱)

غدا (آنے والا کل) اور ظنون (گمان) دونوں تجریدی معانی رکھتے ہیں مگر شاعر نے ان کو محسوسات بنا کر پیش کیا ہے۔ آنے والے کل کو اس نے کھائی سے تعبیر کیا ہے اور اس کے بیان کے مطابق گمان لرزہ یا اندام ہیں۔

ان کے اسلوب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر انسان کو انسان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ غیر انسان کا مطلب محض محسوسات ہی نہیں بلکہ اس میں مجردات بھی شامل ہیں اور انسان بنا کر پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تجریدی اشیاء میں زندگی پھونک دیتے ہیں۔ اور ان کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہ انسانوں کی طرح چل پھر رہے ہیں۔ مثلاً ایک مدت کے بعد وہ دوستوں کے گھر آئے اور اسے اجڑا ہوا پایا اس پر وہ یوں گویا ہوئے۔

والبلى الصرته راى العيان　　ويداه تنسجان العنكبوت

صحت يا ويحك تبدو في مكان　　كل شئ فيه حي لا يموت

مزید کہتے ہیں۔

كل شئ من بسرور وحزن　　والليالي من بهيج وشجي

---

(۱) تطور الادب الحديث ص ۳۳۳ (قصيدة الغريب)

وانا اسمع اقدام الزمن وخطی الوحدة فوق الدرج (۱)

بلی (بوسیدگی) تجریدی معنی ہے اسے شاعر نے نہ صرف محسوس بناکر پیش کیا ہے اور نہ صرف اس میں زندگی ڈال دی ہے بلکہ اسے ایک انسان کی شکل میں پیش کیا ہے جو اپنے ہاتھوں مکڑی کا جالا بن رہا ہو۔ اسی طرح زمان (زمانہ) اور وحدۃ (تنہائی) دونوں تجریدی معانی ہیں انہیں بھی اس نے انسان بناکر پیش کیا ہے۔ جو اپنے قدموں سے چلتا ہے۔

ناجی کے اسلوب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کی براہ راست تعبیر و ترجمانی کرنے کے بجائے ان کی تصویر کشی کرتے ہیں یہ تصویر کشی بسا اوقات جزئی تصویروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جن کی ترکیب سے ایک فکر کو مجسم پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً ناجی کہتے ہیں۔

کم تقلبت علی خنجره لا الهوی مال ولا الجفن غفا (۲)

اور بسا اوقات کوئی مکمل تصویر ہوتی ہے جس کے ذریعہ کسی اندرونی نفسیاتی حالت کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارے گئے ایک وقت کو یاد کرکے کہتے ہیں۔

ومن الشوق رسول بیننا ونديم قدم الكاس لنا

---

(۱) مختارات من الشعر العربي الحديث۔ ص ۷۷ (قصیدہ العودہ)

(۲) تطور الادب الحديث ص ۳۳۷ (قصیدہ الاطلال)

وسقانا فانتفضنا لحظة　　لتراب آدمی سنا (۱)

واقعہ یہ ہے کہ نہ تو خارج میں کوئی پیغام بر ہے جو شاعر اور اسکی محبوبہ کے درمیان پیغام رسانی کر رہا ہے اور نہ کوئی ساقی ہے جو ان دونوں کو جام پلا رہا ہے۔ بلکہ محض خیالی تصویر کشی ہے۔

ناجی کے اسلوب کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں وصف میں جدت پائی جاتی ہے وہ اپنی شاعری میں ایسے ایسے اوصاف استعمال کرتے ہیں جن کا نہ تو پہلے کوئی لغوی استعمال ملتا ہے اور نہ ہی شعری سرمایہ میں ان کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ مثلاً عورت کو قدیم شاعری میں کسی نے شمس (سورج) کسی نے قمر (چاند) کسی نے غصن (ٹہنی) تو کسی نے کسی دوسری چیز کے مشابہ قرار دیا ہے۔ مگر ناجی اس کے کچھ دوسرے ہی اوصاف بیان کرتے ہیں۔

این من عینی حبیب ساحر　　فیہ نبل وجلال وحیاء

واثق الخطوہ یمشی ملکا　　ظالم الحسن شہی الکبریاء

عبق الحر کانفاس الربی　　ساھم الطرف کاحلام المساء

مشرق الطلعۃ فی منطقہ　　لغۃ النور وتعبیر السماء (۲)

ان اشعار میں استعمال ہونے والے تمام اوصاف میں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ قدیم شاعری میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے کہ اس انداز

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۳۸　قصیدہ الاطلال

(۲) نفس مصدر　ص ۳۴۰

عورت کے اوصاف کے طور پر پیش کیا جاتا ہو۔

ناجی کی شاعری میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ اگرچہ اپنے بعض قصائد میں ایک ہی وزن وقافیہ کا لحاظ کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے قصائد ایسے بھی ہیں جو کئی کئی مقطعوں سے مل کر بنے ہیں۔ ہر مقطع میں قافیہ مختلف ہوتا ہے اور وزن میں بھی فرق ہوتا ہے اور ان میں بھی بسا اوقات ہر دو مصرعے الگ قافیہ کے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات اشعار رباعی یا خماسی کے طرز پر ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار

این شط الرجاء	یا عباب الھموم
لیلتی الواء	ونھاری غیوم
اعولی یا جراح	اسمعی الدیان
لایھم الریاح	زورق غضبان (۱)

ان کے یہ اشعار رباعی طرز پر ہیں۔ جن میں پہلا مصرعہ تیسرے کے مماثل ہے اور دوسرا چوتھے کے۔ اس انداز پر یہ پورا قصیدہ نظم کیا گیا ہے۔

وزن کی تبدیلی کے مثال میں ان کا قصیدہ الاطلال ہے جس کے بیشتر اشعار اس وزن پر ہیں۔

یا فوادی رحم اللہ الھوی	کان صرحا من خیال فھوی
اسقنی واشراب علی انغامہ	واروعنی طالما الدمع روی

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۴۵ (قصیدہ عاصفۃ وروح)

البتہ اختتام سے کچھ پہلے یہ وزن آگیا ہے۔

لست انسی ابدا ساعۃ فی العمر

تحت ریح صفقت لارتقاص المطر (۱)

ان اشعار کے وزن مختصر ہو گئے ہیں اس کے بعد کے اشعار میں پھر سابقہ وزن لوٹ آیا ہے۔ اور اس طرح قصیدہ کا اختتام اس انداز پر ہوا ہے جس انداز پر اس کا آغاز ہوا تھا۔

ابراہیم ناجی کے اسلوب پر اثر انداز ہونے والی ایک اہم چیز ان کے مضامین ہیں۔ ان میں وجدانی پہلو بہت غالب نظر آتا ہے۔ ان کے جذبات پر حزن و ملال کا رنگ غالب ہے۔ وہ کبھی افسوس کا اظہار کرتے ہیں کبھی مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انھیں تنہائی کا بھی احساس رہتا ہے۔ انھیں صرف اپنے انفرادی احساسات، ذاتی الجھنوں اور نجی مسائل سے بحث ہوتی ہے قومی مسائل اور اجتماعی احساسات کا وہ بہت کم تذکرہ کرتے ہیں۔

ان کے اسلوب کی خصوصیت میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی فطرت میں رقت اور اسلوب میں سادگی ایک اہم عنصر کی طرح رچی بسی تھی جس کا اندازہ ہمیں ان کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی اس فطرت میں تبدیلی کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اشعار موسیقیت، سادگی

---

(۱) تطور الادب الحدیث ص ۳۵۰ (قصیدہ الاطلال)

اور رقت سے بھرپور ہوتے ہیں۔[۱]

بالعموم وہ بحر رمل کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اشعار کی موسیقیت برقرار رہ سکے۔ ان قصائد میں وہ بحر خفیف کا استعمال کرتے ہیں جس میں وہ اپنے روحانی دکھ درد کو پیش کرتا ہے اور کبھی کبھی کچھ موضوعات کے لئے بحر طویل اور بحر بسیط کا استعمال بھی کرتے ہیں۔[۲]

---

(۱) ابراہیم ناجی، صورتہ من شعرہ، حسن کامل الصیرفی، المجلہ اپریل ۱۹۵۸ء ص ۱۰۰

(۲) نفس مصدر

مراجع ومصادر

كتب

عربي

(١) ابراهيم ناجي حياته وشعره — صالح جودت، قاهرة سنة ١٩٦٠

(٢) الاتجاه القومي في الشعر العربي الحديث — عمر الدقاق، مكتبة الشرق بحلب، الطبعة الثانية

(٣) الاتجاهات الوطنية — الدكتور محمد حسين، دار الارشاد، بيروت سنة ١٩٧٠ (في جزئين)

(٤) احلى ٢٠ قصيدة حب في الشعر العربي — فاروق شوشة، الطبعة السادسة، دار ابن زيدون، بيروت سنة ١٩٨٧ء

(٥) الادب العربي المعاصر — الدكتور شوقي ضيف، دار المعارف، القاهرة سنة ١٩٦١ء

(٦) الاعلام — خير الدين الزركلي، الطبعة الثانية، الجزء الاول، سنة ١٩٥٩ء

(٧) اعلام النثر والشعر في العصر العربي الحديث — محمد يوسف كوكن، الجزء الثالث، دار حافظ للطباعة والنشر، مدراس سنة ١٩٨٤ء

(٨) تاريخ الادب العربي — احمد حسن زيات، مطبعة الاعتماد، سنة ١٩٣٠، مصر

(٩) تاريخ الادب العربي في العصر الحاضر — ابراهيم علي ابو الخشب، مطابع الهيئة المصرية العامة للكتاب سنة ١٩٨٤ء

(١٠) تاريخ الشعر العربي الحديث، احمد قبش، دار الجليل، بيروت

(١١) تاريخ العالم العربي في العصر الحديث، الدكتور احمد عزت عبد الكريم، الدكتور عبد الحميد البطريق والدكتور ابو الفتوح رضوان، حقوق الطبع محفوظة للوزراء مرة سنة ١٩٥٩ء.

(١٢) تاريخ مصر الاجتماعي احمد ذكي بدوي، مطبعة صلاح الدين الكبرى

(١٣) تاريخ مصر السياسي امين سعيد، دار احياء الكتب العربية، القاهرة سنة ١٩٥٩

(١٤) تطور الادب الحديث في مصر الدكتور احمد هيكل، الطبعة الخامسة، دار المعارف مصر سنة ١٩٨٧ء

(١٥) تطور الشعر العربي الحديث في مصر الدكتور ماهر حسن فهمي، مكتبة نهضة، القاهرة سنة ١٩٥٨ء

(١٦) الجامع في تاريخ الادب العربي حنا الفاخوري، الطبعة الاولى، دار الجليل، بيروت سنة ١٩٨٦ء

(١٧) جماعة ابولو واثرها في الشعر العربي الحديث عبد العزيز الدسوقي، معهد الدراسات العربية العالمية سنة ١٩٦٠ء

(١٨) حديث الاربعاء طه حسين، الجزء الثالث، مطابع دار المعارف مصر سنة ١٩٥٧ء

(١٩) حوار مع قضايا الشعر المعاصر الدكتور سعود عبيس، دار الفكر العربي، القاهرة سنة ١٩٨٥ء

(٢٠) خليل مطران شاعر الاقطار العربية — جمال الدين الرمادى ، دار المعارف بمصر، القاهرة

(٢١) دائرة معارف الشعب — دائرة معارف الشعب، الجزء الثالث، مطابع الشعب القاهرة سنة ١٩٥٩ء

(٢٢) دراسات ادبية — الدكتور احمد هيكل ، الطبعة الاولى ، دار المعارف سنة ١٩٨٠ء

(٢٣) ديوان ابراهيم ناجي — سامى الكيالى ، دار العوده ، بيروت

(٢٤) رائد الشعر الحديث — محمد عبد المنعم خفاجي، الطبعة الاولى ، القاهرة سنة ١٩٥٣ء .

(٢٥) الشعر العربي الحديث — تاليف س موريه ، تعريب الدكتور سعد مصلوح والدكتور شفيع السيد، دار الفكر العربي سنة ١٩٧٠-٧١

(٢٦) شعراء العرب المعاصرين — رضوان ابراهيم ، دار الطباعة الحديثة، القاهرة سنة ١٩٥٨ء

(٢٧) الشعر الجزائرى الحديث اتجاهاته وخصائصه الفنية — الدكتور محمد ناصر ، دار الغرب الاسلامى، بيروت سنة ١٩٨٥ء

(٢٨) الشعر المصرى بعد شوقى — الدكتور محمد مندور - مصر

(٢٩) الشعر والتجديد — محمد عبد المنعم خفاجي، دار العهد الجديد، القاهرة

(٣٠) عصر اسماعيل — عبد الرحمن الرافعي، مطبعة النهضة، القاهرة سنة ١٩٣٢ء

(٣١) عصر محمد علي — عبد الرحمن الرافعي، الطبعة الثالثة، النهضة المصرية القاهرة سنة ١٩٥١م

(٣٢) فصول في الشعر ونقده — الدكتور شوقي ضيف، دار المعارف بمصر

(٣٣) في الادب الحديث — عمر الدسوقي، دار الفكر العربي، القاهرة سنة ١٩٥٢م

(٣٤) قصائد مجهولة — حسن توفيق، مكتبة مدبولي، القاهرة، الطبعة الاولى، سنة ١٩٧٨م

(٣٥) قضايا جديدة في ادبنا الحديث، الدكتور محمد مندور، دار الآداب، بيروت سنة ١٩٥٨م

(٣٦) محاضرات في شعر علي محمود طه — نازك الملائكة، القاهرة، سنة ١٩٦٤-٦٥م

(٣٧) مختارات من الشعر العربي الحديث — مصطفى بدوي، بيروت سنة ١٩٦٩م

(٣٨) مذاهب الادب — الدكتور ياسين الايوبي، دار العلم للملايين الطبعة الثانية سنة ١٩٨٤م

(٣٩) معجم المؤلفين — عمر رضا كحاله، الجزء الاول، مطبعة الترقي بدمشق سنة ١٩٥٨م

(٤٠) مقومات الشعر العربي الحديث والمعاصر — الدكتور محمود شوكت والدكتور رجاء عبيد دار الفكر العربي

(۴۱) من الشعر الحديث — ابراهيم العريض، دار العلم للملايين، الطبعة الاولى، بيروت سنة ۱۹۵۸ء

(۴۲) نشأة الكتابة الفنية في الادب العربي — الدكتور حسين نصار، مكتبة النهضة المصرية القاهرة سنة ۱۹۵۴ء

اردو

(۱) جدید عربی شاعری — نسیم فاروقی، اسلامک بک سینٹر، لکھنؤ سنہ ۱۹۷۷ء

(۲) دائرۂ معارف اسلامیہ — دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول

(۳) عربی شاعری کے جدید رجحانات — سید احتشام احمد ندوی سنہ ۱۹۶۹ء، دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

مقالات

عربي

(١) ابراهيم ناجي تحية ذكرى — الدكتور مختار وكيل، مجلة الكتاب، مصر، مئي سنة ١٩٥٣ء، العدد ٥ -

(٢) ابراهيم ناجي الشاعر المقيم المسافر — عدنان الداعوق، مجلة ثقافة الهند، نيودلهي، سنة ١٩٧٩ء، الاعداد/١-٤ -

(٣) ابراهيم ناجي صورته من شعره — حسن كامل الصيرفي، مجلة "المجلة"، قاهره ١٥ ابريل سنة ١٩٥٨ء، العدد/ ٦١

(٤) جماعة الپولو واثرها في الشعر الحديث — مصطفى عبد اللطيف السحرتي، مجلة "المجلة" قاهره مارچ سنة ١٩٦١ء، العدد/ ٥١

(٥) صديقي ابراهيم ناجي — احمد رامي، مجلة الهلال، قاهره، مئي سنة ١٩٥٣ء العدد/ ٥

(٦) غراميات ناجي — صالح جودت، مجلة "المجلة" قاهره، اكتوبر سنة ١٩٦٠ء، العدد/ ٤٦

(٧) قصتي مع جماعة الپولو واثرها في الشعر الحديث — عبد العزيز الدسوقي، مجلة "العلوم" بيروت، اگست سنة ١٩٦٨ء، العدد/ ٨

(٨) من اغاني شكسپير ومن ازهار الشر لبودلير — ترجمه المغفور له الدكتور ابراهيم ناجي، مجلة الكتاب مصر، جون سنة ١٩٥٣ء، العدد/ ٨

(٩) ناجي الشاعر الوجداني عدنان الداعوق، مجلة المعرفة، قاهرة نوفمبر ١٩٦٤-٦٥ سنة، العدد/٣٣

(١٠) ناجي الشاعر والانسان محمود الشرقاوي، مجلة الهلال، قاهرة سبتمبر ١٩٦٧ سنة، العدد/٩